دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی **شعور و آگہی** لاہور

جولائی تا ستمبر 2018ء / شوال المکرّم تا ذوالحجہ 1439ھ جلد نمبر 10 شمارہ نمبر 3 رجسٹرڈ نمبر S-370

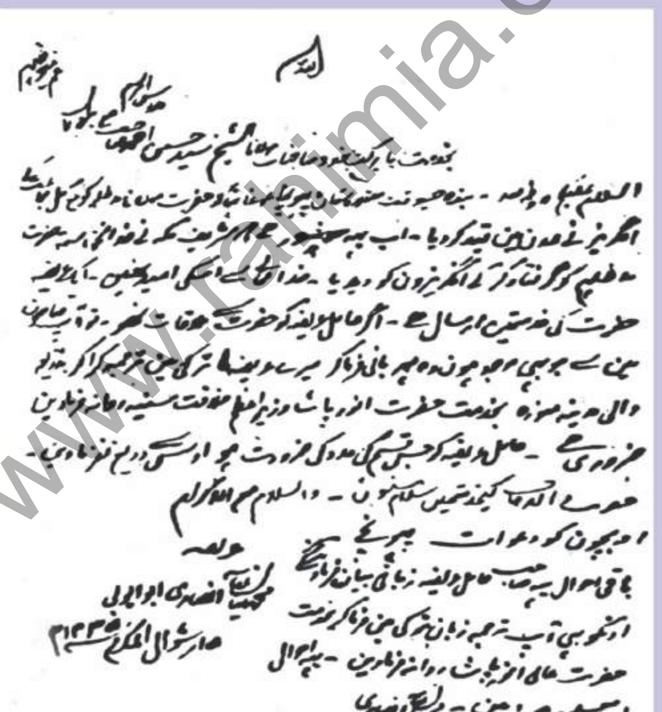

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سیاسی بصیرت

''میں حکومتِ (برطانیہ) کا ہمدرد نہیں، بلکہ خود اپنے ملک کا ہمدرد ہوں۔ لوسنو! بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگِ (عظیم دوم) کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا یقینی ہے۔ کیوں کہ اگر انگریز جیت بھی گئے، تب بھی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اور انٹرنیشنل معاملات کی وَجہ سے وہ اس درجے کمزور ہوجائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی ملوکیت (حکمرانی) قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اور انھیں مجبور ہوکر ہمیں خودمختاری و آزادی دینی ہوگی۔ پس اگر یہ (آزادی حاصل ہونا) یقینی ہے تو ہمیں ابھی سے نیشنل فوج اور قومی سول ایڈمنسٹریشن کا انتظام کرنا اور ان کے لیے نوجوانوں کو تربیت دینا ہے۔ فوجی ٹریننگ کی صورت اس سے بڑھ کر اَور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوج میں بھرتی کرائیں۔ فرض کرو اگر اس طرح ہم نے ایک لاکھ نوجوان فوج میں بھیجے اور اُن میں سے پچاس ہزار مرکھپ بھی گئے تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے، وہ تو آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے، جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے۔

اس کے برخلاف اگر ہم نے جنگ میں عدمِ تعاون کی منفی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لیے ہمیں انھیں زنگ آلودہ کل پُرزوں سے کام لینا ہوگا، جن سے آج انگریزی اقتدار کی مشین چل رہی ہے۔ اور اس کا جو کچھ انجام ہوگا، وہ یہ ہی ہوگا کہ عنوان بدل جائے گا، مگر معنون وہ ہی رہے گا۔ قالب مختلف ہوگا، مگر ایڈمنسٹریشن کی روح وہی رہے گی۔ اس بنا پر ضرورت ہے کہ چندٹکوں کی خاطر فوج میں بھرتی ہونے والے ہندوستانی نہیں، بلکہ ملک کے سچے ہمدرد اور محبِّ وطن اور صحیح الخیال ہندو مسلمان نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبے سے ملٹری کی تعلیم حاصل کریں کہ اب انھیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کرنی ہوگی۔''

(حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سیاسی بصیرت، ص 61)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جولائی تا ستمبر 2018ء / شوال المکرّم تا ذوالحجہ 1439ھ | جلد نمبر 10 شمارہ نمبر 3 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی: حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست: پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

مدیرِ اعلیٰ: حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

صدر: مفتی عبدالمتین نعمانی

مدیر: مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف لاہور ☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی سکھر ☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر اسلام آباد

☆ مفتی عبدالقدیر چشتیاں ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر جھنگ ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر اسلام آباد

☆ مفتی محمد مختار حسن نوشہرہ ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل سعودی عرب ☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف حسن ابدال

☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی شکارپور ☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین بہاولپور ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر لاہور

قیمت فی شمارہ : -/150 روپے

سالانہ زرِتعاون -/600 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ رجسٹرڈ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی''، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

اداریہ
حرفِ اوّل — مدیرِ اعلیٰ — 3

مطالعۂ تحریکاتِ آزادی
تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق اہم دستاویزات (2) — تحقیق و ترجمہ: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری☆ — 5
حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے نام اہم مکتوب

مطالعۂ سیاسیات
حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سیاسی بصیرت — تحریر: حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ☆ — 55
('مجذوبِ سندھی' کی چند الہامی باتیں)
عناوین و حواشی: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

ولی اللّٰہی افکار؛ عصری اہمیت
اسلام اور عدلِ اجتماعی — خطاب: حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — 69
(ولی اللّٰہی تعلیمات کی روشنی میں بنیادی تصورات)

مطالعۂ حالاتِ نوآبادیات
نوآبادیاتی ریلویز: برطانوی سامراج کا معاشی پہیہ — تحریر: محمد اکمل سومرو☆ — 91

شخصیات
اپنی ذات میں اِک انجمن سی شخصیت — تحریر: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن☆ — 107
حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسند نشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ — سابق ایڈیٹر برہان، دہلی و سابق ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

☆ محمد اکمل سومرو — پی ایچ ڈی سکالر ڈیپارٹمنٹ آف سیاسیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور

☆ ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن — سابق پروفیسر موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

قوموں کی ترقی ایسی اہل قیادت اور نابغۂ روزگار شخصیات کے سبب سے ہوتی ہے، جو بلند فکری، اعلیٰ علم و شعور اور جرأت مندانہ سیرت و کردار کی حامل ہوتی ہے۔ ایسی پُرعزم قیادت جو ہر لمحے بدلتی ہوئی قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال اور نئے پیدا ہونے والے سیاسی، معاشی اور فکری مسائل کا صحیح ادراک رکھتی ہے۔ وہ درپیش مسائل کے حل کے لیے معروضی تقاضوں کے مطابق صحیح لائحۂ عمل اختیار کرتی ہے۔ مشکل حالات میں بھی پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ ملک و قوم کی ترقی کے لیے جدوجہد کا صحیح راستہ اپناتی ہے۔ اقوام کی قیادت ایسے درست ہاتھوں میں ہو تو وہی قومیں اپنا قومی وجود برقرار رکھتے ہوئے ترقی کرتی ہیں۔

گزشتہ صدی کی دوسری چوتھائی میں مظلوم انسانیت اور خاص طور پر مسلمان بڑی مشکلات کے ماحول سے گزر رہے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل میں مسلمانوں کی بین الاقوامی حکومت خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس وقت عالمِ اسلام کی حالت یہ تھی کہ وہ جنگِ عظیم اوّل میں شکست کھا کر برطانیہ اور فرانس کی بندر بانٹ کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ مسلمان حکمران طبقوں میں یہ سکت نہیں رہی تھی کہ وہ عسکری بنیادوں پر لڑ کر اپنی کوئی شناخت پیدا کر سکیں۔ جنگِ عظیم اوّل (1914ء تا 1918ء) اور جنگِ عظیم دوم (1939ء تا 1944ء) کے درمیانی عرصے میں دنیا اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد یورپین طاقتوں کے درمیان باہمی رسہ کشی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ 1933ء میں ہٹلر نے جرمنی کا حکمران بننے کے بعد فرانس، برطانیہ اور روس کے خلاف محاذ آرائی کا ماحول گرم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح یورپ کی چار بڑی طاقتیں آپس میں ایک دوسرے کو زیر کرنے اور مفادات اٹھانے کے لیے جنگ کا ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ ایسے پُرصعوبت ماحول میں جذبات سے بالاتر ہو کر ملک و قوم اور مسلمانوں کے لیے صحیح شاہراہِ فکر و عمل اختیار کرنا لازمی تھا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اس دور میں مسلمان سامراجی طاقتوں کے زیرِ اثر کسی ایسے غلط راستے کا انتخاب نہ کر لیں، جو سامراجی قوتوں کے آئندہ کے مفادات کا اسیر ہو کر رہ جائے۔

برعظیم پاک و ہند میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سلسلے کے علمائے حق اور رہنمایانِ قوم کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے رومانوی تصورات اور ذاتی تمناؤں کے حصار سے آزاد ہو کر حقائق شناسی کی بنیاد پر ملکی اور قومی مسائل کا صحیح تعین کیا ہے۔ پھر ان مسائل کے حل کے لیے صحیح فکر اور لائحۂ عمل اختیار کیا ہے۔ گزشتہ صدی کے رُبعِ ثانی میں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت رہے کہ جنھوں نے ولی اللّٰہی سلسلے کے علما بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی صحبت و تربیت سے ایسی مہارت اور صلاحیت حاصل کی تھی، جس کی بنیاد پر انھوں نے حالات و واقعات کا درست تجزیہ کیا اور صحیح لائحۂ عمل اختیار کیا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس وقت حرمین شریفین میں تھے۔ ان کے سامنے کابل، ماسکو اور استنبول میں قیام کے زمانے کے تجربات و مشاہدات تھے۔ نیز وہاں کے باخبر حلقوں کے ذریعے سے دنیا کے حکمران حلقوں میں موجود بے چینی اور کیے جانے

www.rahimia.org

والے فیصلوں سے آگہی حاصل تھی۔ اس بنا پر مولانا سندھیؒ یہ سمجھ چکے تھے کہ یورپین طاقتوں کے درمیان ایک نئی جنگ چھڑنے والی ہے۔ عالمی جنگ کا ماحول تیار ہو رہا ہے۔ ایسے میں خوب غور وفکر کے ساتھ برعظیم پاک و ہند میں بسنے والی اقوام بالخصوص مسلمانوں کے لیے درست لائحۂ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خطے میں دو سو سالہ غلامی کے نتیجے میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ جھگڑوں کے باعث پیدا ہونے والے فکری مسائل سے نمٹنے اور سیاسی اور معاشی مسائل کے حوالے سے اس خطے کی ترقی کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ مولانا سندھیؒ نے ان امور پر غور وفکر کیا اور ایک مکمل نظامِ فکر وعمل متعین کیا۔

مولانا سندھیؒ کا اندازہ تھا کہ برعظیم پاک و ہند اپنی وسعت اور عوامی پھیلاؤ کے سبب اس جنگِ عظیم کے نتیجے میں ضرور آزادی حاصل کرے گا۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ یہاں کے لوگ اپنا فکری اور علمی نظام قومی بنیادوں اور اپنا سیاسی اور معاشی نظام اجتماعیت کے اصولوں پر استوار کریں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس خطے کی اقوام کو کم از کم اپنے سیاسی اور معاشی فکر وعمل میں وحدت پیدا کرنی ہوگی۔ بالخصوص اس دور میں مسلمانوں کو بادشاہوں کے زمانے سے پیدا ہونے والی تعلّی اور بالادستی کی سوچ کو ایک طرف رکھنا ہوگا اور اس خطے کی معروضی صورتِ حال کے تناظر میں تنگ نظری اور فرقہ وارانہ سوچ کے دائرے سے نکل کر اپنے فکر وعمل کو وسعت دینی ہوگی۔ خطے کی دیگر اقوام کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی حکمتِ عملی بنانی ہوگی۔ اس کے لیے اُن کے سامنے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ وفکر کی اہمیت واضح ہوئی۔ اسلام کی صحیح تعبیر پر مشتمل یہ فلسفہ کل انسانیت کی ترقی کا دینی پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کی بقا کا درست راستہ یہ ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر وعمل کا صحیح فہم پیدا کیا جائے۔

مولانا سندھیؒ کا اندازہ یہ بھی تھا کہ اس دور میں اقوامِ عالم کو بدلتے ہوئے عالمی حالات میں اُبھرتی ہوئی نئی ریاستوں کی سیاسی تشکیل؛ قومی دستور، آئینی جمہوریت اور صنعتی ترقی کی اساس پر معاشی نظام ایسے بنیادی امور سے ہوگی۔ اس دور میں عوامی طاقت سے ہی آئین و دستور اور قومی حکومتیں وجود میں آئیں گی۔ یورپین طاقتوں کے درمیان پیدا ہونے والی رسہ کشی اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی عالمی جنگ سے یہ بات یقینی معلوم ہو رہی تھی کہ ان طاقتوں کو ایشیا اور افریقا کے ممالک کو آزادی دینا ہوگی۔ اس طرح خطے آزاد ہوں گے اور انھیں قومی جمہوری خطوط پر ہی استوار کرنا ہوگا۔ اس جنگ کے نتیجے میں برطانیہ کمزور ہوگا۔ سرمایہ دار دنیا کی طاقت نئی اُبھرتی ہوئی امریکی ریاست کی طرف منتقل ہوجائے گی۔ ایسے میں یہ ضروری ہے کہ نئے سامراج کے چنگل میں پھنسنے کے بجائے جدید دور کے طور طریقے کمزور ہوتی ہوئی برطانوی طاقت سے ہی سیکھ لیے جائیں۔ اس لیے کہ آنے والے دور میں جدید ترقیات اور ریاستوں کی تشکیل کے قومی نظام سے روگردانی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے مولانا سندھیؒ نے بڑی دور اندیشی کے ساتھ ملک اور قوم کو چند بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی۔ اس شمارے میں مولانا سندھیؒ کی ایسی ہی چند الہامی باتوں پر مشتمل ایک اہم مقالہ ''حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی دور اندیشی اور بصیرت'' کے عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس شمارے کے دیگر مقالات؛ ''تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق اہم دستاویزات'' کی دوسری قسط، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں دیے گئے ایک علمی لیکچر بہ عنوان ''اسلام اور عدلِ اجتماعی''، برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے حوالے سے ایک اہم تحقیقی مقالہ ''نوآبادیاتی ریلویز: برطانوی سامراج کا معاشی پہیہ'' اور حضرت الاستاذ مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کی شخصیت پر ایک مقالہ ''اپنی ذات میں اک انجمن سی شخصیت'' کے عنوانات سے شاملِ اشاعت ہیں۔ (مدیرِ اعلیٰ)

www.rahimia.org

مطالعۂ تحریکاتِ آزادی

تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق اہم دستاویزات

حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے نام اہم مکتوب

تحقیق وترجمہ: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(2)

عرضِ مرتب

(گزشتہ شمارے میں جمعیت حزب اللہ ہند و یاغستان کے ماتحت برپا کی گئی تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق چند دستاویزات اور خطوط شائع کیے گئے تھے۔ اس کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ: ''قبائلی علاقے یاغستان سے حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ نے 4/ اگست 1917ء کو چند خطوط اور دستاویزات حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ارسال کیں، جو انگریزوں کے ہاتھ لگیں۔'' ان خطوط اور دستاویزات میں سے 1 سے 2 اور 4 سے 7 تک کے مکتوبات اور دستاویزات گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں تیسرا مکتوب جو حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ نے یاغستان کے حالات کے حوالے سے حضرت شیخ الہند، سلطان العلما، مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے نام لکھا تھا، وہ اپنی طوالت کے سبب گزشتہ شمارے میں شائع نہ ہوسکا۔ اس شمارے میں اس طویل اور اہم مکتوبِ گرامی کو شائع کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ کے اس مکتوبِ گرامی سے تحریکِ شیخ الہندؒ کے متعلق بہت سے اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کے بنیادی مقاصد و اہداف کیا تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعیت حزب اللہ نے اپنا بیس کیمپ یاغستان کو بنایا تھا۔ اس لیے اس مکتوب میں یاغستان کا جغرافیائی محلِ وقوع، وہاں کے قدرتی معدنی وسائل، سیاسی اور معاشی حالات کی قرار واقعی صورتِ حال، افغانستان کی حکومت میں مختلف گروپس کی باہمی کھینچا تانی، روایتی علما و مشائخ کا سیاسی حوالے سے منفی کردار اور افغان علاقے کی سیاسی صورتِ حال کا بہت اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے حکومتِ مؤقتۂ ہند کے بارے میں مولانا محمد میاں انصاریؒ کی ذاتی رائے بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مولاناؒ نے اس مکتوب میں افغانستان میں بھیجے گئے تُرک جرمن سفارتی مشن سے متعلق بھی کچھ بنیادی حقائق واضح کیے ہیں اور اس کی ناکامی کی وجوہات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس مکتوب سے تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق بہت سے اہم امور پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ مکتوب اصل میں شستہ فارسی زبان میں ہے، اس لیے اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ نیز اس میں زیرِ بحث آنے والی شخصیات کا مختصر تعارف حواشی میں پیش کر دیا گیا ہے۔ مرتب)

مکتوبِ گرامی مولانا محمد میاں انصاری

بنام

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

(اردو ترجمہ)

بسم اللّٰہ

الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین، و سلامٌ علیٰ المرسلین، و آلھم، و أصحابھم أجمعین

بہ یمن ملاحظہ مخدوم الانام، مطاعِ خواص وعوام، سیّدی ومولائی

حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلطان العلماء

أدام اللّٰہ تعالیٰ برکاتھم

السّلام علیکم، و علیٰ من لّدیکم

یہ ناکارہ بندہ عافیت کے ساتھ ہے اور مولوی فضلِ ربیّ صاحب مہاجر و غازی[1] کے ہمراہ ملا صاحب بابڑہ[2] کی جگہ پر مقیم ہے۔ مولوی فضلِ ربیّ صاحب اس وقت حضرت نائب السلطنت سردار نصر اللہ خان[3] سے ملاقات کے لیے کابل گئے ہوئے ہیں۔

گزشتہ سال (۱۳۳۴ھ/1916ء) چند خطوط آں جناب کی خدمت میں مختلف ذرائع سے بھجوائے تھے۔ اُن میں سے ایک خط (مکتوبہ مؤرخہ ۸؍رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ 9؍جولائی 1916ء) حاجیوں کے ذریعے سے بھیجا تھا۔ اس وقت تک یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ پہنچا، یا نہیں۔ اس سال دوبارہ یہاں کے حالات (آپ تک) پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پہنچائے۔ آمین ثم آمین!

پورا احوال نامہ دوبارہ شروع سے بیان کرتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ معلوم نہیں کہ میرے گزشتہ خطوط کا کیا حال ہوا۔

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

(جدہ سے گھر تک کے حالات)

بندہ آپ کے قدمِ مبارک سے جدا ہوا اور عافیت کے ساتھ بمبئی پہنچ گیا۔ حضرت غالب پاشا[4] کے فرمان کے تعاون کے سلسلے میں مولوی عبدالقیوم صاحب نے راستے میں بڑی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ سفر کے درمیان ہی مولوی مرتضیٰ حسن[5] کے ایسے آثار ظاہر ہوئے کہ وہ اس کام میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ہندوستان میں آنا بھی بے کار ثابت ہوا۔ **إنّا لِلّٰہ و إنّا إلیہ راجعون.**

بمبئی میں مولوی ظہور صاحب[6] اور مولوی انیس[7] آئے۔ انھوں نے ملاقات کی۔ بندہ سفر کے درمیان قاضی (محی الدین

www.rahimia.org

احمد قاضیٔ بھوپال) صاحب[8]، حکیم (عبدالرزاق انصاری) صاحب[9] اور پانی پت سے فارغ ہوا اور اپنے گھر پہنچا۔ اور اس جگہ کچھ دنوں آرام کیا۔

(کلکتہ کا سفر اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی سے ملاقات)

کلکتہ کا سفر ہوا اور ابوالکلام (آزاد) اور حسرت (موہانی) کے سامنے کابل کے سفر کے انتظام پر مشورہ ہوا۔ افسوس کہ حسرت (موہانی) کی ہمت قید کی نذر ہوگئی۔ ابوالکلام (آزاد) کو پہلے صوبہ بنگال سے نکلنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد انھیں صوبہ بہار کے رانچی مقام پر نظر بند کر دیا گیا۔ کام کے سلسلے میں اُن سے رجوع کا امکان مجھے نظر نہیں آتا۔

(ہندوستان کی صورتِ حال)

ہندوستان میں جو مدعیانِ وفا تھے، جناب قاضی صاحب، حکیم صاحب، سیّد نور[10]، مولوی رام پوری[11] وغیرہ سے وفا ظاہر نہیں ہوئی۔ اس وَجہ سے اور نیز حکیم مسعود[12] اور مہتممین[13] اور اُن کے احباب جمیل وغیرہ سرکاری پیادے ثابت ہوئے۔ انھوں نے بندہ کا کام مشکلات سے پُر بنا دیا۔ اس وَجہ سے بندہ نے یاغستان اور کابل کا ارادہ کیا۔

حضرت غالب پاشا دام اقبالہٗ کا فرمان قاضی صاحب، حکیم صاحب اور رائے پور[14] اور مخلص احباب مولانا حمداللہ صاحب (پانی پتی)[15]، مولانا ظہور صاحب، مولانا مبین صاحب[16]، مولانا احمد ابومحمد (چکوالی) صاحب[17] وغیرہ کے سامنے ظاہر کر دیا۔ اور ہدایات بھی دے دیں۔ ان میں سے قاضی صاحب سست تھے اور باقی لوگ کام کے لیے وقف ہیں۔

(یاغستان کا سفر)

بندہ جمادیٰ الاخریٰ ۳۳(۱۳)ھ (اوائل مئی 1915ء) کے آخر میں یاغستان کے سفر کے ارادے سے گھر سے رُخصت ہوا۔ راستے کے سفر کے انتظام میں مولانا ابومحمد (چکوالی) صاحب اور مولوی عبدالرحیم افغان نے اپنے سر خطرہ برداشت کیا۔ مولوی ابومحمد صاحب نے خود بھی ساتھ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی طرح خواجہ عبدالحیٔ صاحب[18] نے بھی چاہا، لیکن جماعت کے بعض کاموں کی وَجہ سے وہ حضرات نہیں آسکے۔

بندہ رجب کے مہینے میں علاقہ مہمند میں داخل ہوا اور سنگر کا مقام دیکھا۔ اور یکم رجب (۱۳۳۳ھ/ 15 مئی 1915ء) کی نمازِ عصر حاجی صاحب (ترنگ زئی)[19] مہاجر اور غازی کے ہمراہ پڑھی۔ سب تعریفیں اللہ کی ہیں کہ اُس نے ہمیں آپ کی برکت سے اپنے دشمنوں کے گھر سے باہر نکالا۔

(یاغستان کے حالات)

حاجی صاحب علاقہ بُنیر، سوات اور باجوڑ سے نکل کر علاقہ مہمند میں لکڑ کے مقام پر صافی قوم کے درمیان مقیم ہو چکے ہیں۔ اُن کے ہمراہ ہمارے احباب مولوی فضل محمود مہاجر[20] اور مولوی عبدالعزیز صاحبان[21]، مولوی تاج محمد صاحب بی۔اے[22] اور اُن کے مریدوں میں سے مہاجرین کی ایک جماعت بھی ہے۔ اور مولانا فضلِ ربیّ صاحب، مُلّا صاحب بابڑہ کے ہمراہ ان کی جگہ پر تھے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن صاحب[23] حاجی صاحب (ترنگ زئی) سے جدا ہوکر کابل چلے گئے تھے۔

www.rahimia.org

یہ تمام لوگ یاغستان میں خاص طور پر مہمند کے علاقے میں پشاور کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اس لیے کہ پشاور کا راستہ جنگ کی وَجہ سے بند تھا اور کافی مدت سے یہاں کے لوگ تنگ ہیں۔ اس وَجہ سے یاغستان کے جاہل لوگوں نے انگریزوں کے ساتھ اس شرط پر صلح کر لی کہ:

''اگر امیر المؤمنین اور خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین [24] ہندوستان آئے تو ہماری تمھارے ساتھ صلح باقی نہیں رہے گی۔''

میں اس وقت یہاں پہنچا کہ جب بابڑہ مُلّا صاحب ان کی صلح کو ختم کروانے اور انھیں سزا دینے کے لیے مہمند کے دورے پر تھے۔ مولانا فضلِ ربیّ صاحب مہاجر اُن کے ہمراہ تھے۔ بندہ تو چند روز اپنے پاؤں کے زخمی ہونے کی وَجہ سے معذور تھا۔ کچھ دن آرام کے بعد اس دورے میں جناب مُلّا صاحب بابڑہ اور مولانا فضل صاحب مہاجر کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مُلّا صاحب اس ملک کے رواج کے مطابق اُن لوگوں کے گھروں کو جلانے میں مصروف تھے کہ جو لوگ صلح کے لیے انگریزوں کے پاس گئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے اکثر مکان کے گھروں کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

مُلّا صاحب اور مولانا فضلِ ربیّ صاحب عجیب غازی مرد ہیں۔ مُلّا صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرؓ کی شان اور کام کی حالت رکھتے ہیں۔ عجیب بے خوف اور متوکل اور کفار کا دشمن مسلمان ہے۔ آخر انھوں نے وہ صلح ختم کروا دی۔ ...

(کابل کا سفر)

اس جگہ آ کر معلوم ہوا کہ کابل جانے کی ضرورت ہے۔ مولوی فضلِ ربیّ صاحب چند مجاہدینِ کرام لوگوں کو بُنیر سے لائے اور چمرکنڈ میں مستقل قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اُن میں ایک شخص مولوی عبدالرحیم لاہوری عرف بشیر [25] کو انھوں نے کابل روانہ کیا تھا۔ اُس بندۂ خدا نے اپنا کام اور اپنی جماعت کا کام کیا اور بس۔ بلکہ انھوں نے کابل کے سفر سے واپس آ کر دھوکا اور فریب کیا۔

آخر بندہ نے ایک وفد ترتیب دیا، جس میں مولانا فضلِ ربیّ صاحب، مولوی فضل محمود، عبدالعزیز اور مُلّا صاحب بابڑہ کے دو برادرِ نسبتی اور ایک مُلّا مہمند تھے۔ انھیں میں خود اپنے خرچ پر اپنے ہمراہ شعبان (۱۳۳۳ھ/ وسط جون 1915ء) کے شروع میں کابل لے گیا۔ اس جگہ مولانا عبیداللہ (سندھی) مہاجر اور مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر و غازی سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ مولانا عبیداللہ صاحب عزت کے ساتھ اپنے حسبِ عادت بڑی تمناؤں میں مستغرق تھے۔ اور مولانا سیف صاحب دو ہزار سالانہ وظیفے پر وہاں مقیم تھے۔ وہاں جا کر مسٹر محمد ابراہیم ایم۔اے کرانچوی [26] سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ کابل کے کالج میں ملازم ہیں اور مولوی عبیداللہ صاحب کے ساتھ اُن کی تمناؤں میں شریک ہیں۔

(نائب السلطنت سردار نصر اللہ خان سے ملاقات)

بندہ کی حاجی عبدالرزاق خان غازی [27] سے ملاقات ہوئی۔ وفد کو اُن کے سامنے پیش کیا۔ وہ مناسب عزت سے پیش آئے۔ اور بندہ کو اور وفد کو نائب السلطنت اور جہاد کا شوق رکھنے والے سردار نصر اللہ خان کے حضور میں پیش کیا۔

(سلطان العلما مولانا محمود حسن کے اغراض و مقاصد پیش کیے)

(نائب السلطنت کے سامنے) بندہ کی درخواست کا مضمون یہ تھا کہ حضرت سلطان العلما مولانا محمود حسن صاحب نے اس

وَجہ سے کہ ہندوستان کو کافروں سے چھڑانا فرض ہے، یہ انتظام فرمایا ہے کہ:

(۱) اپنے خادموں کو یاغستان کے علاقے میں روانہ کیا ہے۔

(۲) مولوی عبیداللہ (سندھی) کو کابل بھیجا ہے۔

(۳) وہ خود خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین کے کمانڈروں کے پاس ملاقات کے لیے گئے ہیں۔

(۴) بندہ کو سلطان کے قائم مقام اور صوبہ حجاز کے والی غالب پاشا کا فرمان دے کر اس سفر پر اس غرض سے روانہ کیا ہے:

(الف) اس جنگ میں یاغستان کے علاقے کو حکومتِ افغانستان کے ساتھ متحد کیا جائے۔

(ب) ان دونوں کے مجموعے کو تختِ خلافت کے ساتھ متحد کیا جائے، تاکہ ہندوستان کی فتح کا فریضہ ادا کیا جائے۔

یاغستان کے کوائف کے بارے میں یاغستان کا وفد عرضِ حال بیان کرنا چاہتا ہے۔ اور بندہ اس لیے حاضر ہے کہ اگر تختِ خلافت کے ساتھ اتحاد کے بارے میں کوئی شرائط ہوں تو بندہ ایران کے راستے سے اُن کو خلافتِ عالیہ کے خدام تک پہنچائے اور حضرت سلطان العلما (مولانا محمود حسن) کے ذریعے سے دونوں حکومتوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔

یاغستان کے وفد نے اپنے جہادی کاموں اور انگریزوں کے ساتھ پیدا ہونے والی دشمنی اور حکومتِ افغانستان کے ساتھ یاغستان کے علاقے کی دوستی کے امور بیان کیے۔ اور مہمند سے لے کر علاقہ آلائی جو کہ کشمیر سے متصل ہے، تک کے اپنے مراکز شمار کرائے۔

نائب السلطنت نے اراکینِ وفد مولانا فضلِ ربیّ صاحب، عبدالعزیز و مولوی فضل محمود صاحبان کو چار چار سو سالانہ وظیفہ دینے پر یاغستان کے کام کرنے کے لیے مقرر کیا۔ اور دوسرے اراکین کو بھی وظائف دیے۔ اور سپرد شدہ کاموں کا حکم دیتے ہوئے رخصت کیا۔ انھوں نے بندہ کو کابل میں رہنے کا حکم دیا اور وعدہ کیا کہ امیر (حبیب اللہ خان) صاحب سے مشورے کے بعد تمھیں اس کام پر روانہ کیا جائے گا۔ بندہ سے ملاقات خاص طور پر مکمل تخلیے میں ہوئی، جس میں سوائے بندہ اور حاجی عبدالرزاق خان صاحب کے اَور کوئی نہیں تھا۔

(تُرکی اور جرمنی مشن کے اراکین سے ملاقات)

اپنے کابل میں قیام کے زمانے میں سب سے پہلے میں تگاؤ مُلّا صاحب کے پاس پہنچا۔ اُن سے اور صوفی محمد جان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ترکی اور جرمنی وفد کے اراکین میں سے مسٹر فان ہنتک افسر جرمن، و مسٹر نیڈن مائر [28] جرمن (سفیر) متعین ایران، چین کے راستے سے روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ راجہ مہندر پرتاپ[29]، جناب برکت اللہ صاحب بھوپالی[30] اور جناب موسیٰ کاظم بے [31] موجود تھے۔ اُن کے ارادے اسلام کی خدمت کے بارے میں بڑے بلند تھے، لیکن حکومتِ افغانستان کی سخت حدود و قیود اُن کے راستے کی رُکاوٹ تھی۔

(امیرِ کابل اور دیگر اُمرائے افغانستان کے حالات)

اصل بات یہ ہے کہ امیر (حبیب اللہ خان) صاحب [32] کابل طبعی طور پر انگریزوں کے دوست ہیں۔ اُن میں اسلام کی روح اور غیرت بالکل نہیں ہے۔ وہ عیاشی کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ البتہ نائب السلطنت (سردار نصراللہ خان) پُرغیرت مسلمان

ہے۔ جہاد کا شوق رکھتا ہے۔ جس وقت جرمن اور تُرکی سفارت یہاں پہنچی تھی تو نائب السلطنت، معین السلطنت سردار عنایت اللہ خان (33) کو اپنے موافق کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ امیر صاحب کا دوسرا بیٹا جو ''معین الدولہ'' (34) کا خطاب رکھتا ہے، شروع سے ہی نائب السلطنت کے موافق ہے۔ اس صورت میں امیر (حبیب اللہ خان) اپنی رائے میں تنہا رہ گیا تھا اور بے کار ہوگیا۔ نائب السلطنت کی رائے غالب آ گئی۔ اُس نے عوام میں جوش پیدا کر دیا۔

(افغانستان کے علما و مشائخ کا غلط کردار)

اس موقع پر امیر (حبیب اللہ خان) نے کام میں رُکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اُس نے علما و مشائخ اور اکابرِ سلطنت کا ایک جرگہ بنا دیا۔ اس دوران حضرت چار باغی یعنی معصوم ضیاء (جلال آبادی) (35) کے ذریعے سے معین السلطنت (عنایت اللہ خان) کو نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خان) سے جدا کر دیا۔ چناں چہ اُس کا گروپ کمزور ہوگیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ عوام کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور ایک رسالہ ''اطاعتِ اولی الامر'' کے عنوان سے ایک مُلّا کی جانب سے لکھوایا اور اُس پر قاضی القضاۃ مُلّا سعد الدین خان کے دستخط کروا کر شائع کروا دیا۔ جس میں عوام پر یہ ظاہر کیا گیا کہ: ''امیر کی مخالفت کرنا اسلام کی مخالفت ہے۔''

حضرت چار باغی کے بارے میں کسی نے یہ شعر کہا ہے ؎

بیک باغی ہزاراں فتنہ خیزد
چہ مے باشد، چوں باشد چار باغی

(ایک باغی ہزاروں فتنے برپا کر دیتا ہے، اُس وقت کیا ہوگا، جب چار باغی ہوگا۔)

بالآخر امیر (حبیب اللہ خان) غالب آ گیا اور نائب السلطنت کے ہاتھ سے کام نکل گیا۔

(یاغستان کے بارے میں مستوفی الممالک نے خرابی پیدا کی)

یاغستان میں پیدا ہونے والے جوش کے بارے میں بھی اسی پیرِ فرتوت (چار باغی) کے خادمِ خاص مستوفی الممالک (وزیرِ مالیات مرزا محمد حسین) (36) نے بڑی خرابی پیدا کی۔ سلطانِ ترکی کے سفیروں؛ حضرت کاظم بے، مولانا برکت اللہ صاحب اور افغانستان کا ملازم ایک تُرک خیر الدین نامی اور ایک عرب احمد آفندی کو تیراہ (آفریدی) کی جانب بھیجا گیا تھا۔ اُن کی وَجہ سے وہاں ایک مضبوط تحریک پیدا ہوگئی تھی۔ اور نائب السلطنت نے مخفی طور پر وہاں یہ ظاہر کیا تھا کہ افغانستان کی حکومت کے اشارے سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اس کی وَجہ سے اُن لوگوں کا وہاں رُعب قائم ہوگیا تھا، لیکن مستوفی الممالک نے اس راز کو فاش کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ لوگ کمزور ہوئے اور ان کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ چناں چہ مہمند اور باجوڑ میں بھی امیرِ کابل کے کافروں کے ساتھ دوستانہ رویے کی وَجہ سے سُستی کے آثار نمودار ہونے لگے، لیکن اس جگہ علمائے مہاجرین کی کوششوں اور مُلّا صاحب بابڑہ کی صحیح نیت اور عزم کے سبب پوری طرح خرابی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

(امیرِ کابل نے ترکی اور جرمنی کے سفیروں کو کابل سے نکال دیا)

امیر نے اپنا غلبہ حاصل کر لینے کے بعد جرمنی اور ترکی کی سفارت کے اراکین کو کابل سے نکال دیا۔ راجہ (مہندر پرتاپ)

صاحب اس خیال سے بلخ (مزار شریف) کی طرف روانہ ہوئے کہ وہ روس کے راستے سے امریکا جائیں گے۔ جناب مولانا برکت اللہ صاحب اور جناب کاظم بے صاحب ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ (آخر ستمبر 1916ء) کے آخر میں ہرات کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ ابھی تک راجہ صاحب مزار شریف میں ہیں اور مولوی صاحب اور کاظم بے ہرات میں ہیں۔ اُن کی حیثیت وہاں نظر بندوں کی سی ہے، گو ظاہری طور پر بڑی مکاری کے ساتھ عزت دی جا رہی ہے۔

ان لوگوں کی کابل سے روانگی کے وقت امیر کابل اور معین السلطنت نے سفیروں سے ملاقات بھی نہیں کی، البتہ نائب السلطنت نے انھیں دوستانہ طور پر رُخصت کیا۔ گزشتہ روز راجہ صاحب کا آدمی کپتان تیجا سنگھ [37] نیپال جانے کے خیال سے بندہ سے رُخصت ہوا۔ اس وقت وہ مزار شریف سے آیا تھا۔ راجہ صاحب خیریت سے ہیں اور روس کے راستے سے جانے کے خیال سے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چوں کہ روس کی سلطانِ تُرکی سے صلح ہوچکی ہے، اس لیے جانے کی اُمید بہت قوی ہے۔ ممکن ہے کہ کاظم بے بھی روس کے راستے سے روانہ ہوں۔ بندہ کا ارادہ حضرت کاظم بے کے ساتھ آنے کا تھا۔ انھوں نے منظور بھی کرلیا تھا، مگر حکومتِ افغانستان راضی نہیں ہوئی۔ إنّا لِلّٰہ و إنّا إلیہ راجعون۔

(چمرکنڈ کا سفر)

انھوں نے سفیروں کی روانگی کے بعد بندہ اور مولوی سیف الرحمٰن صاحب کو بھی بغیر جواب دیے رُخصت کردیا۔ بندہ عیدالاضحیٰ (۱۰/ذی الحج) ۱۳۳۴ھ (8/اکتوبر 1916ء) کو علاقہ مہمند میں چمرکنڈ پہنچا۔ مولوی سیف الرحمٰن صاحب جلال آباد میں مقیم ہوگئے۔

(تحریکِ جہاد کا آغاز)

نمازِ عیدالاضحیٰ کے بعد مُلّا صاحب بابڑہ اور حاجی صاحب ترنگ زئی کی شرکت میں ہم نے تحریکِ جہاد کا آغاز کردیا۔ مہمند، ماموند، چارمنگ اور دیگر باجوڑ کے قبائل سخت جدوجہد کے بعد محرم ۱۳۳۵ھ (نومبر 1916ء) میں (انگریزوں سے) مقابلے کے لیے ڈیری، چناری اور مٹہ میں جمع ہوئے۔ چناں چہ ۱۷/محرم الحرام (13/نومبر 1916ء) کے دن لڑائی کی۔ یہ جنگ ایک دن کی تھی۔ اس لیے کہ اس سے زیادہ یہ لوگ طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس جگہ ایک کارتوس کی قیمت ایک روپے ہے اور لوگ غریب ہیں۔ مجمع پہلے تقریباً پچیس ہزار تھا، مگر اسلحہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ واپس چلے گئے۔ تقریباً دس ہزار افراد جنگ میں شریک تھے۔ ان لوگوں کے پاس اگرچہ بندوقیں اور کارتوس بہت تھے، لیکن مقابلہ چھ توپوں کے نشانے کی زد میں انجن اور ہوائی جہاز اور مشین گنوں، ٹینکوں اور زہریلے بموں سے تھا۔ اس کے باوجود ان لوگوں کا ثابت قدم رہنا حیرت انگیز ہے۔

اس جنگ میں انگریزوں نے پہلے برقی تار کی دیوار بھی استعمال کی۔ اسی سبب سے غازی لوگ غنیمت حاصل کرنے اور اُن پر حملہ کرنے سے محروم رہے۔ اس لڑائی میں آٹھ افراد شہید اور دس زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں ایک مشہور غازی مہمند قبیلے کا ملک کامل خان [38] بھی تھا۔ ایک ہوائی جہاز کی بندوق سے اُن کی ران پر زخم لگا۔ الحمدللہ تعالیٰ! اُس کے بعد وہ شفایاب ہوگیا۔ انگریزوں کے نقصان کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ اُن کی کم ترین نقصان کی روایت یہ ہے کہ ایک سو پچاس آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اُن کے دو ہوائی جہاز غازیوں کی بندوقوں سے بالکل ٹوٹ گئے۔ ایک انگریز اور ایک سکھ ہوا باز قتل ہوگیا۔ باقی تین سخت زخمی ہوئے۔ باقی جہازوں کو بھی کچھ نقصان پہنچا۔ کل جہاز آٹھ تھے اور چھوٹے بڑے چار توپ خانے تھے۔ جنگ کا میدان پچیس میل لمبا تھا۔ یہ

www.rahimia.org

جنگ دریائے کابل اور دریائے سوات کے درمیان لڑی گئی۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک برقی اور خاردار تار بھی لگی ہوئی تھی۔

اس جنگ کے علاوہ قریباً روزانہ انگریز علاقے میں شب خون کے لیے لوگ روانہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا برقی تار سے گزر کر جانا قابلِ تحسین ہے۔ جہاد کے بعد ایک روز انھوں نے اس تار کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا، لیکن اس کے بعد انھوں نے ایک ایسی مضبوط تار لگائی کہ ہماری قوت اُس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ مگر شب خون مارنے کے لیے آنے جانے میں یہ رُکاوٹ نہیں تھی۔

(سوات کا سفر)

اس جہاد سے فراغت کے بعد بندہ نے سوات کا سفر کیا۔ کوہستان مُلّا [39] کے ساتھ پانچ مہینے تک مغززنی کرتا رہا۔ وہ جہاد کے بجائے مسلمانوں کے درمیان جنگ قائم کیے ہوئے ہے۔ سوات نواب دیر کے ماتحت تھا، اس نے اس سے چھین لیا اور سوات میں انگریز کا اثر غالب کر دیا۔ نواب دِیر کا ارادہ سلطانِ تُرکی کے اعلانِ جنگ کی وَجہ سے انگریز کی مخالفت کا تھا، مگر کوہستانی کی حرکت نے اُس کی قوت کو کمزور کر دیا۔ ابھی تک بھی وہ اس خیال کے لیے لشکر تیار کیے ہوئے ہے۔ چناں چہ اس نے آغاز بھی کر دیا تھا کہ مولانا فضلِ ربی صاحب، مولوی تاج محمد صاحب بی۔اے مہاجر اور مولوی کمال الدین آفریدی [40] کو بھیجا گیا کہ وہ اس کو اس حرکت سے باز رکھیں۔

(بندہ کے طریقۂ کار میں تبدیلی)

افغانستان کا بُرا حال دیکھ کر بندہ نے اپنے طریقۂ کار میں کچھ اس طور سے تبدیلی کر لی تھی کہ ہر تحریک اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کے اسمِ گرامی سے شروع کی تھی، لیکن افسوس کہ ہماری مالی حالت اس کام کے مطابق ہے، نہ خلافت قریب ہے۔ بہرحال آلائی، بُنیر، سوات، باجوڑ اور مہمند کے لوگوں کو اس بات پر تیار کر لیا ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کے لوگوں کے آنے کی صورت میں وہ لوگ اُن کی مدد کریں گے۔ اس عہد میں بااثر علما ومشائخ اور ہر قوم کے ملکان وخوانین شامل ہیں۔ اس وَجہ سے انگریزوں کے مقابلے پر سلطانِ تُرکی کے اعلان کے بعد جنابِ والا کے خادموں کی تحریکات درجِ ذیل ہیں:

(۱) حاجی صاحب ترنگ زئی کی تحریک پر بُنیر میں ۱۳۳۳ھ (1915ء) کا جہاد۔

(۲) جناب مُلّا صاحب بابڑہ اور جناب مولانا مولوی فضلِ ربّی مہاجرِ اوّل کی تحریک سے مہمند اور باجوڑ میں ۱۳۳۳ھ (1915ء) کا جہاد۔

(مہمند اور باجوڑ میں جہاد کا حال)

اس جہاد سے پہلے مُلّا بابڑہ مہمند میں مقیم تھے۔ چند ماہ تک انھوں نے شب خون مارنے اور مختصر حملے کرنے کا سلسلہ قائم کیا ہوا تھا۔ مولانا فضل بھی اُن کے ہمرا تھے۔ تجویز ہوئی تھی کہ مسلسل چھ ماہ تک اس لڑائی کو مضبوطی سے جاری رکھا جائے گا، مگر چوں کہ کفار کے جاسوسوں نے پانی میں زہر ڈال دیے تھے، اس وَجہ سے اس ارادے میں رُکاوٹ ہوگئی۔ تاہم چند مہینے شب خون اور ہلکے حملے کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔

www.rahimia.org

پھر ۱۳۳۳ھ (1915ء) میں ایک عام حملے کے لیے دوبارہ جمع ہوئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں مجاہدین کا مجمع پچاس ہزار سے بھی زائد تھا۔ کافروں سے جنگ اور وبا کی وَجہ سے چند سو مجاہدین شہید ہوگئے اور کفار دو ہزار مارے گئے۔ مشہور ہے کہ اُن میں ایک پوری کمپنی ماری گئی۔ بندوقیں، کارتوس اور کڑ چھے وغیرہ اسبابِ غنیمت میں آئے۔ مہمند کے لوگ ایک پوری کمپنی کو مارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے برخلاف دیگر یاغستانی لوگ ہیں، جو کمپنی کی طاقت سے ڈرتے ہیں۔ اس سے پہلے حضرت بڈے مُلّا صاحب علیہ الرحمہ کے اجازت یافتہ حکفور؟ کی سرپرستی میں خالص مہمندوں کی ایک جماعت نے ایک بڑا شب خون مارا تھا، جس میں پانچ سو آدمی تھے۔ انھوں نے بہت سے انگریزوں کو قتل کیا اور مالِ غنیمت بھی خوب حاصل کیا تھا۔ یہ سلسلۂ جنگ اور شب خون کم وبیش جاری تھا کہ حاجی صاحب ترنگ زئی تیراہ سے مہمند آئے اور محرم ۱۳۳۴ھ (نومبر 1915ء) میں بابڑہ مُلّا صاحب کے ہمراہ جنگ میں شرکت کی۔ اس جہاد کے وقت مولانا فضلِ ربی صاحب مہاجر تحریکات پیدا کرنے کے لیے آلائی اور کشمیر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے کامیاب لوٹے۔ اگر ہندوستان پر حملے کا وقت آپہنچا تو اس کامیابی کا فائدہ ہوگا۔

(یاغستان کا حدودِ اربعہ اور یہاں کی اقوام کے حالات)

علاقہ یاغستان' ہندوستان اور افغانستان کی حدود کے درمیان واقع ہے۔ یہ وزیرستان سے آلائی تک طویل ہے، جو کہ کشمیر کی حدود کے ساتھ متصل ہے۔ یہ علاقہ غیرت مند افغانوں کی اقوام پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ جنگی اسلحہ، ہر طرح کی بندوقیں اور کارتوس رکھتے ہیں۔ پانچ فائر کرنے والی انگریزی فوجی بندوق بھی بہت ہے۔ اُس کی قیمت دو ہزار سے تین ہزار ہے۔ جرمنی کی بندوق بھی ہے۔ ایک بندوق بہت اچھے لوہے کی ہے۔ یہ بھی جرمنی کی طرح پانچ فائر کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ ایک فائر کرنے والی انگریزی بندوق بہت ہے۔ اس کے علاوہ بندوق سازی کے جرمنی کے کارخانے بھی تیراہ اور مہمند میں بہت ہیں کہ اُن میں ایک فائر کرنے والی بندوق سے لے کر دس فائر کرنے والی بندوقیں بناتے ہیں۔ مگر یہ لوگ کارتوس نہیں بنا سکتے، البتہ خالی کارتوس کو بھر لیتے ہیں اور وہ بھی اعلیٰ درجے کا نہیں ہوتا۔ کارتوس اگر انگریزی ہو تو اس جگہ پر انگریزی بندوق ہی کام دیتی ہے۔ یہ لوگ انگریزوں اور افغانستان کے معاہدے (معاہدہ ڈیورنڈ لائن 1893ء) کے اعتبار سے انگریزوں کی رعایا ہیں، لیکن اپنی غیرت کی وَجہ سے انگریز حکومت اور امیرِ کابل کو اپنے سے دُور رکھتے ہیں اور آزاد ہیں۔

(وزیرستان، تیراہ اور مہمند کے علاقے کے حالات)

وزیرستان، تیراہ اور مہمند کے علاقے کے لوگ اپنے درمیان خوانین کی حکومت بھی نہیں رکھتے۔ ہر دس پر ایک مَــلَک ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کے رواج کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، یا یہاں علما اپنا اثر رکھتے ہیں، مگر حکومت کسی آدمی کی نہیں ہوتی۔

(باجوڑ، سوات کا علاقہ اور اُس کے خوانین کے حالات)

باجوڑ، ملیزئی (دِیر)، سوات، بُنیر، چکیسر، کانڑا، غوربند اور آلائی وغیرہ کے علاقے کے بعض حصے میں خوانین کی حکومت ہے اور بعض حصے آزاد ہیں۔ ان خوانین میں سب سے مضبوط ترین نواب دِیر ہے۔ اور یہاں کی سرسبز وشاداب اور وسیع زمین شاہِ کاشغار (چترال) کی ہے۔ نواب دِیر بھی انگریزوں سے تعلق رکھتا ہے اور دیگر خوانین بھی انگریزوں سے وظائف لے کر کھاتے ہیں۔ دِیر

www.rahimia.org

کے علاقے سے ایک راستہ گلگت اور یارقند (چین) کی طرف جاتا ہے۔ اس راستے کے عوض فرنگیوں سے یہ دو ہزار وظیفہ لے کر کھاتے ہیں، لیکن یہ سب آزاد ہیں۔ یہاں کے خوانین اگرچہ طبعی طور پر حکومتِ اسلامیہ کی جانب میلان اور شوقِ جہاد رکھتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ امیرِ کابل بے غیرت ہو چکا ہے اور سلطانِ معظم دُور ہیں۔ واقعی یہ لوگ کسی حکومت کی امداد کے بغیر انگریزوں کے قبضے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اُن کے ساتھ جنگ کرنا بھی ایک کام ہے۔ اُن کی طبیعت کے رُجحان سے ظاہر ہوتا ہے۔

(اس قوم کو کافروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا سخت ناانصافی ہے)

ایسی حالت میں اس قوم کو کافروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سخت ناانصافی اور گناہ ہے۔ صرف اس علاقے سے کم از کم پانچ لاکھ مضبوط فوج بنائی جاسکتی ہے۔ اگر اس علاقے میں آزاد بلوچستان کو بھی شامل کرلیا جائے، جو کہ وزیرستان کی طرف سے زیادہ دور نہیں ہے تو پھر اس سے بھی زیادہ فوج کی نفری تیار کی جاسکتی ہے۔ بلوچستان خلیج فارس سے بھی متصل ہے۔ اس وَجہ سے اس علاقے پر قبضے کی صورت میں خلیج پر تصرف حاصل کرنا یا اتنے بڑے طویل ملک سے تعلق قائم کرنا آسان ہے۔

اس وقت میں وہاں کی صورتِ حال کیا ہے؟ اس جگہ کسی کو معلوم نہیں ہے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اس وقت امیرِ کابل کی بے دینی اور عاقبت نااندیشی کی وَجہ سے اتحادِ اسلام کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اس کی تلافی کرنا ضروری ہے۔ اگر اس جنگ میں اللہ تبارک وتعالیٰ ہند اور مصر بھی سلطانِ معظم کو عطا فرمادے۔

اگر ہندوستان پر حملے کے وقت اس علاقہ یاغستان میں جنگی افسران اور مختصر سامانِ جنگ بھی پہنچ جائے تو بہت مفید رہے گا۔ اس جگہ ہر فرد ایک فوج ہے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی جنگ جُو ہیں۔ جنگ میں مَیں نے دس سالہ بچوں کو پہلی صفوں میں جنگ کرتے دیکھا ہے۔ یہاں پچاس سال کا آدمی جوان ہے۔

(وسطی ایشیا کے علاقے کو ازسرِنو زندہ کرنا ضروری ہے)

اگر ایسا ممکن نہ ہو اور خدانخواستہ ہندوستان کافروں کے قبضے میں ہی رہے تو پھر وسطی ایشیا کے علاقے کو نئی زندگی دینے کے لیے ضروری ہے کہ کل یاغستان کو ایک معاہدے کے ذریعے سے اپنے دائرے میں لے لیا جائے اور یاغستان کے لیے ایک مناسب راہ کا فیصلہ کرلیا جائے۔ حضرت خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین وسطی ایشیا کو ازسرِنو زندہ کرنے کے لیے اپنے کچھ افسران اور سامان کے ساتھ اس جگہ روانہ فرمائیں، ورنہ افغانستان اور ہندوستان کے حالات تو ظاہر ہیں۔ اور اس جنگ کے بعد زیادہ بدتر ہوجائیں گے۔ پھر وسطی ایشیا کے مسلمانوں کا خدا حافظ ہے۔

یاغستان کے اندر اگر اسلام کا نظم ونسق قائم کرنے والے لوگ ہوں گے تو یہ بھی وسطی ایشیا میں افغانستان کے ہم مرتبہ ہوجائے گا۔ اس سے ہندوستان اور چین وغیرہ اور خود افغانستان میں تحریک پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان کام کرنا انگریز اور امیرِ کابل کی وَجہ سے بہت سی دُشواریوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔

(یاغستان کے افغانوں میں جمہوریت کے مشابہ نظام)

اگر یاغستان کے افغان قبضے میں آجائیں تو یہ قوم بڑی طبع زاد ثابت ہوگی۔ اس کے باوجود یہاں کوئی حکومت نہیں۔ جنگ

www.rahimia.org

اور باہمی اختلافات رہتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ اپنے درمیان ایک ایسا نظام رکھتے ہیں، جو جمہوریت کے مشابہ ہے۔ انھوں نے اس قدر اسلحہ فراہم کیا ہوا ہے کہ بہت زیادہ مہنگائی کے باوجود قابلِ تعریف ہے۔ خود بندوق سازی کا بھی آغاز کیا ہوا ہے۔ جاننے والے کہتے ہیں کہ یاغستان کی بندوق امیرِ کابل کے کارخانے کی بندوق سے بہتر ہے۔ مشین گن بھی بناتے ہیں، مگر پختہ فولاد نہ ہونے کی وَجہ سے صحیح نہیں بن پاتی۔ اس وقت کے دِیر کے علاقے میں پُرانی توپوں کی تعداد چار ہے۔ کارتوس بھی بناتے ہیں۔ اگر چند اعلیٰ کاری گر اس جگہ دست یاب ہوجائیں تو اس جگہ یہ کام خوب پھیلا سکتے ہیں۔

(یاغستان میں معدنیات کی صورتِ حال)

یہ ملک مختلف طرح کی کانوں سے بھرا ہوا ہے، لیکن اس جگہ نہ کوئی کانوں کا پہچاننے والا ہے اور نہ کان کن ہے۔ امیرِ کابل کا علاقہ بھی اسی حالت پر ہے۔ یاغستان میں اکثر جگہوں پر لوہے کی کانیں ظاہر ہوئی ہیں۔ یہاں کے لوہے کا کام کرنے والے بڑی مشکل سے مٹی سے لوہے کو حاصل کرتے ہیں، مگر علم نہ ہونے کی وَجہ سے معذور ہیں۔ اگر اس ملک میں سرمایہ خرچ کیا جائے تو اِن نشاء اللہ تعالیٰ بڑی کامیابی کی اُمید ہے۔

(خوانین سے تحریری وعدہ)

بندہ نے مہمند سے سوات تک خود سفر کیا اور آلائی کے خوانین سے دیگر معززین کے ذریعے سے رابطہ کیا۔ اُن سے ترکی کے افسران کی مدد کا تحریری وعدہ لیا۔ اس عریضے کے ہمراہ غالب نامے کی نقل کی پشت پر تحریر کردہ اُس کا ایک مختصر نمونہ ارسال کر رہا ہوں۔ اس تحریر کے علاوہ دیگر خوانین کی تفصیلی تحریریں بھی بندہ کے پاس ہیں۔ اگر خداوند تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوا تو انھیں اپنے ہمراہ لے کر آؤں گا۔ بندہ کی حاضری میں تاخیر ہو رہی ہے، مگر خداوند تعالیٰ کے کرم سے مفید تجربے حاصل ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کی خدمت میں حاضری کے راستے میں رُکاوٹیں ہیں، لیکن امید ہے کہ اِن نشاء اللہ تعالیٰ اسلام اور خلافتِ اسلام کے لیے بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ یہ رُکاوٹیں جلد ہی ختم ہوجائیں گی۔

(یہاں انقلابِ روس کا بڑا چرچا ہے)

اس جگہ پر اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ روس کا بادشاہ معزول ہوگیا ہے۔ پارلیمنٹ قائم ہوگئی ہے۔ حضرت سلطانِ معظم سے صلح ہوگئی ہے۔ قفقاز اُن کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ایران اور بخارا آزاد ہوگئے ہیں۔ اس خبر نے یہاں بہت سی اُمیدیں پیدا کر دی ہیں۔ مگر امیرِ کابل کی حالت اُسی طرح ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو پھر باری تعالیٰ سے توقع ہے کہ روس کے راستے سے میری آپ کے پاس حاضری کی صورت پیدا ہوجائے۔

(سوات کے حالات)

دو چار باتیں ملکِ سوات کے بارے میں بھی عرض کرنی ہیں۔ ممکن ہے کہ راستے میں کارآمد ہوجائیں۔ یہ ملک عرب قبائل کی طرح جفاکشی، مضبوط اعصاب کا مالک اور اپنی آزادی رکھتا ہے، البتہ یہاں کے لوگ کفر کے نام سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عالمِ دین اگر یہ کہہ دے کہ: ''اگر یہ کام ایسے نہ کیا تو کافر ہوجاؤ گے۔'' تو پھر اُس کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ یہاں علما و مشائخ کا

اثر محض اسی سبب سے ہے۔ اس خاص معاملے میں مہمند قوم باقی تمام اقوام سے آگے ہے۔ وزیر قوم میں بھی یہ کیفیت ہے۔ اور تیراہ (آفریدی قبائل) میں انگریز کے اثر سے دُنیوی طمع اور لالچ کام کا باعث بن چکی ہے۔ البتہ یہ تینوں اقوام ایفائے عہد میں مشہور ہیں۔ وزیر اور مہمند قبائل میں ملکی ضروریات کے لیے زراعت کافی ہے، مگر آفریدی قبائل میں کم ہے۔ باقی یاغستان کا ملک ایفائے عہد میں دوسرے نمبر پر ہے، لیکن سلطانِ ترکی کے لوگوں سے نافرمانی کی ان سے بھی توقع نہیں ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کہ سلطانِ ترکی کے خادم سامان اور منتظمین کے ساتھ یہاں آئیں۔

ان تمام علاقہ جات میں خواہ وہ خوانین کے زیرِ حکومت ہوں یا آزاد علاقے ہوں، دینی اتباع میں سادات کا ادب، خاص طور پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کا ادب زیادہ ہے۔ اس جگہ کے مشائخ میں علاوہ معمولی نماز روزہ کے سوائے لنگر چلانے کے دوسرا کوئی اَور کمال نہیں ہے۔ اگر پانچ سو روپے ڈبل ماہوار کسی شیخ کے لنگر میں صَرف کیے جاتے ہوں تو اُس سے بڑا شیخ اَور کوئی نہیں سمجھا جاتا۔

(یہاں پر کام کرنے کا طریقۂ کار)

یہاں پر کام کرنے کی صورت یہ ہے کہ:

(الف) ایک ایسا پشتو جاننے والا عالمِ دین جو اگر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے سیّد ہو تو بہت بہتر ہے۔ اپنے باسلیقہ مریدین کے ساتھ اس جگہ آجائے اور لنگر کا سلسلہ قائم کر کے یہاں قبضہ کر لے۔

(ب) ایسے سیاسی منتظمین اور مدبرین جو شریعت کی پابندی کی شکل و صورت رکھتے ہوں، اس جگہ آئیں۔ معتبر مشائخ کے ذریعے سے اس جگہ اقوام اور خوانین میں اپنا تعارف حاصل کریں اور اس مقام کی مصلحتوں کے مطابق کام کریں۔

(ج) اس جگہ کے لوگوں کو کسی کے سامنے پیش ہو کر اگر دینی نفع حاصل ہو اور اُن کے جھگڑے نمٹانے کی صورت پیدا ہو جائے تو یہاں کے آزاد لوگ عشر بھی ادا کریں گے کہ اب تک اس جگہ عشر نا کافی ہے۔

(د) اگر یہاں کی معدنیات کو نکالنے کی صورت پیدا ہو جائے تو بہت آمدنی ہو سکتی ہے۔ سوات، ملیزئی (دِیر)، چترال کے علاقے بہت سرسبز و شاداب ہیں، مگر یہاں اصل ضرورت اس کی ہے کہ ہمیں یہاں پورا سرمایہ اس جگہ خرچ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد اُس سے ہم پورا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ تمام بحث محض اُس صورت میں ہے جب کہ ہندوستان سلطانِ ترکی کے ہاتھ میں نہ آئے۔ اور پھر وسطی ایشیا کو ازسرِنو زندہ کرنے کی ضرورت پیشِ نظر ہو۔ اگر یاغستان میں تہذیب و ترقی کی صورت پیدا ہو جائے تو افغانستان میں آمد و رفت اور قومی تعلقات کی وَجہ سے تحریک پیدا ہونا لازمی ہے۔

(ذاتی منافع پر اجتماعی کام کو برباد نہ کرنے والے مخلص حضرات)

اس علاقے میں مشائخ بہت ہیں، لیکن اس کام میں مُلّا صاحب بابڑہ اور مولانا فضلِ ربی ہمارے کام کا واسطہ اور ذریعہ ہیں۔ یہ نہایت مخلص لوگ ہیں۔ ذاتی فائدے کے لیے اجتماعی کام کو برباد نہیں کرتے۔ ان کے برخلاف دیگر صاحبان درست نہیں

www.rahimia.org

ہیں۔ مُلّا صاحب بابڑہ کے اخلاص اور اُن کے قدیمی اثر ورسوخ کی وَجہ سے علاقہ مہمند، باجوڑ اور سوات میں اُن کا رُعب اور اعتبار بہت زیادہ ہے۔ یہ حضرات دوسرے علاقہ جات میں بھی کارآمد ہوسکتے ہیں۔

(ترکی سے آنے والے منتظمین کے لیے یہ امور لازم ہیں)

اس علاقے میں اس کام کے لیے وقف کرنے والے منتظمین کے لیے درجِ ذیل امور لازمی ہیں:

(الف) فوری طور پر پشتو زبان سیکھنا شروع کردیں۔

(ب) اُن پر لازمی ہے کہ (یاغستان پر مشتمل علاقے کے) چار حلقے بنائیں:

(۱) وزیر (وزیرستان) (۲) تیراہ (آفریدی)

(۳) مہمند و باجوڑ ملیزئی (دِیر) (۴) سوات، بُنیر وآلائی وغیرہ۔

(ج) اُن میں سے ایک منتظمِ اعلیٰ ہو اور چار منتظم اُس کے ماتحت ہوں:

(۱) ہر حلقے کے لیے ایک ناظمِ تعلیم (۲) جنگ کی تعلیم وتربیت دینے والا ایک استاذ

(۳) کانوں کی پہچان رکھنے والا (۴) انجینئر، اسلحہ ساز، بم اور ڈائنامیٹ ساز وغیرہ

یہ منتظمین ضروری ہیں۔

اگر حضرت خلیفۂ رُسولِ ربّ العالمین وسطی ایشیا کو دوبارہ زندہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تو انھیں ایسے فائدے حاصل ہوں گے کہ باقی عالمِ اسلام سے حاصل ہونے والے فائدوں کے اندازے سے بھی زیادہ ہوں گے۔ افغانستان — جو کہ وسطی ایشیا کا اصل مرکز ہے — میں تحریک پیدا کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اُس سے باہر، مگر اُس کے متصل علاقے میں کام کیا جائے۔ اگر خاص افغانستان پر ہی قبضے کے لیے کام کیا جائے تو اس کے راستے میں بہت سی رُکاوٹیں ہیں۔

یاغستان میں ترکی حکومت کے خادموں کا اعتبار، پہچان اور اُن کے مددگاروں کی تعداد اس قدر پیدا ہوچکی ہے کہ ان خدمتوں کو سرانجام دینے میں بہت زیادہ سہولت پیدا ہوجائے گی۔ اگر مزید احتیاط پیشِ نظر ہو تو پہلے ایک منتظم یہاں کے حالات کو ملاحظہ کرنے کے لیے روانہ کردیا جائے۔ اُس کی اطلاع دینے کے بعد باقی انتظامات کیے جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔

ان موجودہ حالات میں بہترین امر یہ ہے کہ ہر ممکن کوشش کرکے ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر یاغستان اور ہندوستان سے انشاء اللہ تعالیٰ کافی امداد حاصل ہوجائے گی، بلکہ ایسے وقت میں افغانستان کا خاموش رہنا بھی مشکل ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں کا کُل عملہ اور عوام ایسے موقع پر خاموش رہنے کے خلاف ہیں، مگر وہ امیرِ کابل کے شخصی قبضے اور خلافت کی قوت کے دور ہونے کی وَجہ سے مجبوراً خاموش ہیں۔ افغانستان کے عوام بھی جدید توپوں سے مسلح ہیں۔

وزیر اور تیراہ قبائل باہم متصل ہیں۔ تیراہ اور مہمند کے درمیان شنوار کا علاقہ حائل ہے، جو کہ امیرِ کابل کے ماتحت، مگر نیم آزاد علاقہ ہے۔ پھر آلائی تک تمام علاقہ یاغستان سے جڑا ہوا ہے۔ صرف دِیر کے علاقے میں گلگت اور یاقند کا راستہ گزر رہا ہے، جو انگریز کے پاس ہے، مگر اُس پر بھی نواب دِیر نے انھیں ایک تصرف نامہ جاری کیا ہوا ہے۔ انگریز اپنے تصرفات نہیں رکھتے۔

www.rahimia.org

(کچھ باتیں ترکی اور جرمن مشن کے بارے میں)

سلطانِ ترکی اور جرمنی کی سفارت کے بارے میں بھی ایک بات ہے۔ اس سفارتی مشن کی ترتیب اس حوالے سے تو بہت اچھی تھی کہ اس میں ایک ایک افسر ترکی اور جرمنی کا اور ہندوستان سے ایک مسلمان اور ایک ہندو شامل تھے۔ ان کے ہمراہ چند افغان بھی تھے، لیکن نقصان یہ تھا کہ غالبًا اس سفارت کے پاس خرچہ اور سرمایہ صرف جرمنی کا تھا۔ اور یہ بھی کہ اس میں مذہبی اور علمی اشخاص نہیں تھے۔ ایشیا میں یورپ سے دوری کی وَجہ سے جتنا کچھ مذہب اثر رکھتا ہے، سیاست کی باتیں یہاں رائج نہیں ہیں۔ اگر چند دینی علما اس سفارت کے ہمراہ ہوتے اور وہ افغانستان کے علما پر اس وقت جنگ کی فرضیت، خلیفہ اور خلافتِ عثمانی کی اطاعت کی فرضیت ثابت کر دیتے تو بہت مؤثر ہوتا۔

اس کے بعد جس وقت جرمنی کے سفیر مسٹر فان ہنتک نے اپنی قوم کے فائدے نہ دیکھے تو وہ واپس چلا گیا۔ اُس نے اپنے باقی رُفقا کی ہمراہی چھوڑ دی اور وہ کُل سرمایہ بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ باقی جو حضرات رہ گئے تھے، وہ خالی ہاتھ کیا کر سکتے تھے۔ اُن کی حالت تو یہ تھی کہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن۔'' (نہ جا سکتے ہیں، نہ ٹھہر سکتے ہیں۔) اس سفارتی مشن کی بے اثری کی سب سے بڑی وَجہ یہ رہی کہ مسٹر فان ہنتک کا اپنے رُفقا کے ساتھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ اگر راجہ مہندر پرتاپ اس سفارتی مشن کے صدر تھے تو اُن کی اطاعت ضروری تھی۔

بہر حال خلافتِ عثمانیہ کے فوائد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سرمائے سے کسی مسلمان کی صدارت میں علمی اور سیاسی عناصر پر مشتمل سفارتی مشن روانہ کریں۔ اس مشن میں اگر عثمانی قوم کے مشہور لوگوں میں سے کوئی فرد ہونا ضروری ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ طاقت ور افراد یاغستان میں پوری وجاہت کے سامان کے ساتھ داخل ہوں اور کام کریں۔ اگر کہیں پہلی غلطیوں کی مکافات کا وقت ہو تو ایسا کرنا بھی بہت مفید رہے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

(یاغستان کے باقی حالات)

یاغستان کے حالات میں سے یہ بات باقی رہ گئی کہ خیر الدین آفندی اور احمد آفندی کی وَجہ سے تیراہ میں ایک تحریک پیدا ہوئی۔ انھوں نے انگریز کے سر پر چند شب خون مارے۔ کوکی خیل قوم نے سلطانی جھنڈے کو قبول کر لیا۔ امیرِ کابل کی مخالفت اور انگریز کی سیاست کی وَجہ سے اس سے زیادہ کام نہ ہو سکا۔ تیراہ میں چوں کہ وہاں کے اکثر لوگ انگریز کی فوج میں ہیں، وہاں فوجی نظام بالکل مرتب شدہ موجود ہے۔ صرف سرمائے کا نہ ہونا' کام میں رُکاوٹ بن رہا ہے۔ تیراہ سے ایک لاکھ سے زائد فوج کا نظام مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(وزیر قبائل کا انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ)

وزیرستان میں بھی مرتب شدہ فوج موجود ہے اور اس وقت وزیر قوم انگریزوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہے۔ یہ جنگ مستقل صورت اختیار کر گئی ہے۔ انگریزی اخبارات میں اس کا نام ''وزیرستان کی جنگ کا میدان'' رکھا ہوا ہے۔

اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ وزیرستان سے متصل ریاست کاٹ —— جو کہ انگریز کے قبضے میں تھی —— سے عالمی جنگ کے

لیے خرچہ طلب کیا گیا۔ اس ریاست کے رئیس نے چندہ نہیں دیا۔ اپنے بیٹوں کو وزیرستان کی طرف فرار کرا دیا اور عذر یہ کیا کہ: ''ہمارے لڑکے بھاگے ہوئے ہیں اور خوف ہے کہ اُن کی تحریکات سے تمھارے سر پر حملہ ہوجائے۔ پس مجھ کو معذور سمجھئے۔ ہماری اس خدمت کو کافی سمجھیں کہ میں نے تم کو وزیرقوم کی تکلیفوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔'' اس پر انگریزوں کو شبہ ہوا اور انھوں نے اس ریاست کے سربراہ کو گرفتار کرلیا اور ریاست ضبط کرلی۔ چناں چہ اُس ریاست کے رئیس کے بیٹوں نے انگریزوں کے خلاف تحریکات کا آغاز کردیا اور جنگ برپا کردی۔ جنگ کے آغاز میں وزیرستان کے لوگوں کا ایک جرگہ آیا کہ ہم رئیس کے بیٹوں کو تمھارے حوالے کرتے ہیں۔ اس جرگے میں لوگ خفیہ طور پر بڑی تعداد میں اپنی بندوقیں ہمراہ لائے۔ بنوں کے قلعہ سرحد میں جرگہ تھا۔ یہ لوگ وہاں داخل ہوئے اور پورے قلعے اور سامانِ جنگ پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں کو قید کرلیا۔ اس طرح جنگ تین چار درجے زیادہ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں فرنگیوں کے بہت زیادہ نقصانات ہوئے۔

یہاں اخبار بالکل میسر نہیں ہے۔ یہ حالات پشاور سے آنے والے لوگوں سے معلوم ہوئے تھے اور وہ بھی کبھی کبھی۔

اس جنگ کی وَجہ سے فرنگیوں نے مہمند قبائل کے لوگوں سے دوبارہ امن و آشتی کا اظہار کیا۔ چناں چہ انھوں نے مہمند قبائل کے لیے پشاور کا اکثر حصہ بھی آزاد کردیا اور انھیں بہت سی رعایتیں دیں۔ مہمند کے لوگوں نے اس کو اس وَجہ سے منظور کرلیا کہ گزشتہ تین سال سے وہ تکلیف میں تھے۔ امیر کابل بالکل خاموش تھا اور کسی جانب سے انھیں کوئی تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ چناں چہ انھوں نے درجِ ذیل شرائط کے تحت اسے منظور کرلیا:

(الف) ہم شب خون مارنے والوں کی مزاحمت نہیں کریں گے۔

(ب) تمھارے دشمنوں کی مخالفت بھی نہیں کریں گے۔

(ج) سلطانِ ترکی کے ہندوستان پر حملے کی صورت میں ہم بھی تم پر حملہ کریں گے۔

(مہمند قوم کی جنگ)

مہمند قوم کی جنگ جو کہ اخبارات میں شائع ہوئی تھی، وہ محض مہمند لوگوں ہی کی نہیں تھی، بلکہ اُس فوج کا غالب حصہ ترکانی یعنی چارمنگی، ماموند، سالارزئی اور شموزئی کی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ چارمنگ کے خوانین بھی خود اس میں شریک تھے۔ چارمنگ کے خوانین مشہور غازی لوگ ہیں۔ اُن خوانین میں سے چند ایک شہید بھی ہوگئے تھے۔

(ماموند قوم انگریز کی مشہور دشمن قوم ہے)

ماموند قوم انگریز کی مشہور دشمن قوم ہے۔ چارمنگ اور ماموند قبائل میں کوئی آدمی اعلانیہ یا خفیہ طور پر انگریزوں کا وظیفہ خوار نہیں ہے۔ مہمند قوم میں بعض لوگ اعلانیہ طور پر وظیفہ خوار ہیں۔ ان دونوں قوموں کے لوگ انگریزوں کے علاقے میں خفیہ طور پر جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر کبھی نہیں گئے۔ مہمند قبائل کی شہرت کی وَجہ یہ ہے کہ وہ اسلحے میں بڑے ماہر ہیں اور جنگ کے محاذ پر بھی مہمند ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ مہمند جب بھی جنگ کرتے ہیں تو ان اقوام کی پشت پناہی کی وَجہ سے کرتے ہیں۔ یہ اقوام باجوڑ میں آباد ہیں اور مہمندوں سے زیادہ غیرت مند ہیں۔ مہمندوں کی جنگ حملہ آور کے طور پر نہیں ہوتی۔ یہ اقوام توپ اور تفنگ کو کچھ نہیں سمجھتے۔ براہِ راست توپ اور بندوق کے دھانے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں! البتہ ایفائے عہد، اطاعت اور اسلحے کی مہارت میں مہمند

www.rahimia.org

زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ یہاں کا ایک سپاہی اپنی معاشرت کی سادگی کی وَجہ سے ہندوستان سے بھی سستا ہے۔ وہ جہاد کے لیے صرف نانِ جویں اور بندوق کے کارتوس کو کافی سمجھتا ہے۔ پیدل چلنے میں ایسے ہیں کہ گویا کہ خچر سے بھی زیادہ جفاکش ہیں۔ یہ لوگ کوہستان کے علاقے میں صبح کی اذان سے عشا تک سفر کر سکتے ہیں۔

(ہندوستان میں تحریک کے گرفتار لوگ)

ہندوستان میں مولوی صادق (کھڈہ والے) کراچی[41]، مولوی حمداللہ صاحب (پانی پتی)، مولوی احمد (چکوالی) صاحب، دین پور کے پیر صاحب[42] بمع اپنے داماد[43] کے، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی احمد علی لاہوری[44] جو مولوی عبیداللہ سندھی کے رشتے دار ہیں، مولوی عبداللہ (لغاری) سندھی[45] کو انگریزوں نے قید کر دیا ہے۔ ہمارے باقی احباب سے انھوں نے ضمانت لی ہے۔ مولانا خلیل احمد[46] اور مولوی مرتضٰی حسن کو بھی منصوری (شملہ) میں لیفٹنٹ نے طلب کیا تھا، مگر انگریز کے دوستوں (مدرسہ دیوبند کے مہتممین[47] اور مولوی شبیر احمد[48]) کی سفارش سے انھیں نجات ملی۔

(اس سے پہلے تین خطوط ارسال کیے جا چکے ہیں)

گزشتہ سال (۱۳۳۴ھ/1916ء) میں مَیں نے تین خطوط روانہ کیے تھے:

(۱) ایک خط (مکتوبہ مؤرخہ ۸؍رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ 9؍جولائی 1916ء) ہندوستان کے حاجیوں کے ذریعے بھیجا تھا۔ اس کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

(۲) دوسرا اُس سفارتی مشن[49] کے ذریعے جو حکومتِ مؤقتۂ ہند کی جانب سے روس کے راستے سے چین اور امریکا کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ سفارت روس میں گرفتار ہوگئی اور وہ انگریز کے ہاتھ چڑھ گئی۔ انگریزوں نے اُن کو سزائے موت دے دی۔ اُن میں ایک مسلمان جو ہندوستان کے مہاجر طلبا میں سے مولوی عبدالقادر شہید ایم۔اے[50] تھا اور ایک سکھ (ڈاکٹر متھرا سنگھ)[51] تھا۔

(۳) تیسرا ایک خط خلافتِ عالیہ کے سفیر مولوی محمد برکت اللہ صاحب کے ہاتھ بھیجا تھا۔ وہ ہرات میں نظر بند ہیں۔

(کابل میں حکومتِ مؤقتۂ ہند قائم ہوگئی ہے)

جرمن اور ترکی مشن کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور سفیرِ خلافت مولوی برکت اللہ صاحب اور ہمارے مہاجر مولوی عبیداللہ صاحب نے ایک حکومت مؤقتۂ ہند (پروِژنل گورنمنٹ) قائم کی ہے۔ راجہ صاحب اُس کے پریزیڈنٹ، مولوی برکت اللہ صاحب وزیرِ اعظم، مولوی عبیداللہ صاحب وزیرِ داخلہ مقرر ہوئے ہیں۔ وزیرِ داخلہ کے سیکرٹریوں میں سے بندہ بھی ہے۔ چوں کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند نے ایک مرکز یاغستان میں اور دو مرکز نیپال کی جانب تجویز کیے ہیں۔ اس وَجہ سے یاغستان کے مرکز میں کام اُٹھانے کی ذمہ داری بندہ کے سپرد ہوئی ہے۔ یہاں پر مرکز بننے کا مصالحہ تیار ہے، مگر محض لمبے وعدوں کی بنیاد پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ سامان چاہیے۔

(حکومتِ مؤقتۂ ہند کے فائدے اور نقصانات)

یہ حکومت اس وَجہ سے بہت خوب ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے پُرامن تعلقات ہوگئے ہیں، مگر اسلام کے فوائد کے

نقطہ نظر سے نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اُن میں بس ہندوستان کے ہندوؤں کے فائدوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چوں کہ راجہ مہندر پرتاپ چین، جاپان، امریکا، روس اور یورپ کے دیگر ممالک کے لیے یہاں سے روانہ ہوگئے اور اُن کو حکومت کی جانب سے دیگر حکومتوں سے کلی طور پر معاہدات کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ اس وَجہ سے اسلام کے مفاد کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔

بار بار کے تجربوں سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اغیار ہم سے فائدے حاصل کرتے ہیں اور پھر ہمیں تباہ و برباد کرتے ہیں۔ ہمارے لیے تو ہماری اپنی قوت ہی کارآمد ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی قوت دوسروں کے لیے کارآمد ہوتی ہے اور ہمارے لیے مُضِر ہوتی ہے۔ اس وَجہ سے عقل مندی یہی ہے کہ ہمارے پیشِ نظر اسلام اور خلافت کا مفاد رہے۔ ہمارا رویہ صرف مرنجان مرنج والا ہے۔ اس وقت میں دوسروں کو رعایتوں سے مالا مال کرنا آسان ہے، مگر اس کے بعد اس کے نتائج سے محفوظ رہنا بہت زیادہ دشوار ہے۔ ہندوؤں کا مقصد محض ہندوستان کی حکومت بغیر شرکتِ غیرے ہے۔ اس وقت میں وہ اسلام کی مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اسلام کو ہندوستان سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا یہ مقولہ ہے کہ ''ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔'' وہ لوگ برملا کہتے ہیں کہ:

''انگریز فرنگیوں کے ملک میں اور مسلمان ریگستانِ عرب میں چلے جائیں۔ ان کا ہندوستان میں کیا کام ہے۔''

اگر سلطنتِ اسلامیہ باہر سے آئے اور ہندوستان پر قبضہ کرے، پھر مسلمانوں کی اندرونی اور بیرونی قوت حکومت کے لیے کافی ہوگی۔ ہاں! ہمیں ہندوؤں کے ساتھ واجبی رعایت اور حُسنِ سلوک کرنے سے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔ غیروں کی قوت اور کفار کے ساتھ زیادہ مراعات کا سلوک کیا اثر رکھتا ہے۔ اس زمانے میں اس کا تجربہ خلافت سے زیادہ کسی اَور کو نہیں ہے۔

(کاموں کے مراکز کی فہرست اس خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں)

بندہ نے افغانستان کے دفتر سے یاغستان کے کام سے متعلق چند ضروری اطلاعات خفیہ طور پر حاصل کی ہیں۔ اُن میں سے ایک مراکز کی فہرست کی نقل ہے، جو اس عریضے کے ہمراہ روانہ کر رہا ہوں۔ اس فہرست میں افراد کی تعداد کا اندازہ کم از کم ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان کے وظیفہ خواران کی کل فہرست بھی ہے۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد ظاہر ہوئی تو اپنے ہمراہ بمع دیگر خفیہ رپورٹوں اور یاغستان کے احوال کے ساتھ میں آپ کے پاس پہنچوں گا۔

اس خط کو لے کر آنے والا مولوی فضلِ ربی کا آدمی ہے۔ یہ کام کا آدمی ہے۔ اس نے اپنی جان کو اللہ کے راستے میں وقف کر دیا ہے۔

تمام خدام کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے اور دعا کی التجا ہے۔

اس جگہ پر بندے کا نام منصور (52) ہے اور کبھی مُلاّ بھی کہتے ہیں۔

مؤرخہ ۱۵/شوال المکرّم ۱۳۳۵ھ (4/اگست 1917ء)

(مکتوب کا اصل فارسی متن)

مکتوبِ گرامی مولانا محمد میاں انصاری

بنام

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

بسم اللّٰہ

الحمد لِلّٰہِ ربّ العالمین و سلامٌ علیٰ المرسلین و آلھم و أصحابھم أجمعین

بہ یمن ملاحظہ مخدوم الانام، مطاعِ خواص وعوام، سیّدی ومولائی

حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلطان العلماء

أدام اللّٰہ تعالیٰ برکاتھم

السّلام علیکم، و علیٰ من لّدیکم

ایں بندۂ ناکارہ بہ عافیت، وہمراہ مولوی فضلِ ربیّ صاحب مہاجر وغازی در جائے مُلّا صاحب بابڑہ مقیم است۔ مولوی فضلِ ربیّ صاحب دریں وقت کابل برائے ملاقات حضرت نائب السلطنت سردار نصر اللہ خان رفتہ اند۔

درسالِ گزشتہ (۱۳۳۴ھ/1916ء) چند خطوط بہ خدمت آں جناب بہ ذرائع مختلف فرستادم کہ یکے ازاں (خط مکتوبہ مؤرخہ ۸؍رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ 9؍جولائی 1916ء) بہ ذریعہ حجاج بود، تا ایں وقت معلوم نہ شد کہ رسید یا نہ۔ اِمسال باز کوشش احوال رسانی مے کُنم۔ حق تعالیٰ بہ فضلِ خویش بہ رساند آمین ثم آمین۔

(آغاز احوال نامہ)

احوال نامہ را از آغاز باز مے گیرم، چہ حال عرائضِ سابقہ نامعلوم است۔

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم.

(حالات از جدہ تا انبیہٹہ)

بندہ از قدمِ مبارک جدا شدہ بہ عافیت بمبئی رسید۔ در بابِ اعانت فرمان غالبے مولوی عبدالقیوم صاحب در راہ اِمداد نمودند۔ جزاہُ اللّٰہ تعالیٰ خیراً۔ از مولوی مرتضیٰ حسن صاحب آثار عدمِ شرکت درکار درمیانِ سفر ظہور یافت۔ ورودِ ہند ہم سعی در بابِ شان بے کار رفت۔ إنّا لِلّٰہ.... ۔ در بمبئی مولوی ظہور صاحب ومولوی انیس آمدہ، ملاقات کردند۔ بندہ درمیانِ سفر از قاضی صاحب وحکیم صاحب و پانی پت فارغ شدہ بہ خانہ رسید۔ و در آں جا قدرے آرام نمودہ۔

www.rahimia.org

(سفرِ کلکتہ و ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا حسرت موہانی)

سفرِ کلکتہ نمود۔ و در بارۂ ابوالکلام (آزاد) و حسرت (موہانی) انتظامِ سفرِ کابل نمود۔ افسوس! کہ حسرت ہمت در قید شد۔ و ابوالکلام ہمت نہ نمود۔ ابوالکلام را اوّل از صوبۂ بنگال اِخراج نمودند۔ و بعد ازاں در صوبۂ بہار بہ مقام رانچی نظر بند۔ در بابِ مراجعت کہ امر بود امکان نہ دیدم۔

(صورتِ احوالِ ہندوستان)

و در ہند چوں کہ مدعیانِ وفا؛ جناب قاضی صاحب، حکیم صاحب، سیّدنور، مولوی رام پور وغیر ہا وفا نہ نمودند۔ بدیں وَجہ، و نیز حکیم مسعود، و مہتممین، و احبابِ شان جمیل وغیر ہا پیادگانِ سرکاری ثابت شدہ۔ کارِ بندہ راپُر ازعوائق ساختند۔ بدیں وَجہ بندہ ارادۂ یاغستان و کابل کرد۔

فرمان حضرت غالب پاشا دام اِقبالہٗ، قاضی صاحب، حکیم صاحب، و رائے پور، و احبابِ مُخلِصین مولانا حمداللہ صاحب، و مولانا ظہور صاحب، و مولانا مبین صاحب، و مولانا احمد ابومحمد (چکوالی) صاحب وغیر ہا را ظاہر کردہ شد، و ہدایات ہم دادہ شد۔ دریں (اِثناء) قاضی صاحب ست بودند۔ و باقی وقفِ کار۔

(سفرِ یاغستان)

بندہ درآخر جمادیٰ الآخر ۳۳ (۱۳)ھ (اوائل مئی1915ء) بہ ارادۂ سفر یاغستان از خانہ رُخصت شد۔ در انتظامِ راہ مولانا ابومحمد صاحب، و مولوی عبدالرحیم افغان خطرہ بسرِ خود برداشتند۔ خود مولوی ابومحمد (چکوالی) صاحب قصد معیت داشتند، علیٰ ہذا خواجہ عبدالحیٔ صاحب، مگر بعض کار ہائے جماعت مانع آمدند۔ بندہ ہلالِ رجب درعلاقۂ مہمند داخل شدہ بہ مقامِ ''سنگر'' دید۔ و نمازِ عصر غرہ رجب (۱۳۳۳ھ/ 15رمئی1915ء) ہمراہ حاجی صاحب (ترنگ زئی) مہاجر و غازی خواندم۔

الحمد لِلّٰہ الّذی أخرجَنا من دار أعدائہٖ ببرکتکم.

(احوالِ یاغستان)

حاجی صاحب از علاقہ بُنیر وصوات و باجوڑ تیر شدہ بہ علاقہ مہمند بہ مقام ''لکڑ'' درمیانِ قوم صافی مقیم شدہ اند۔ و ہمراہِ شان از احبابِ ما مولوی فضل محمود مہاجر، و مولوی عبدالعزیز صاحبان، مولوی تاج محمد صاحب بی۔ اے و دیگر جماعتِ مہاجرین از مریدانِ شان بود۔ و مولانا فضلِ ربیّ صاحب ہمراہ مُلّا صاحب بابڑہ جائے گیر بودند۔ و مولانا سیف الرحمٰن صاحب از حاجی صاحب جدا شدہ کابل رفتہ بودند۔

گزرآں ہمہ یاغستان علیٰ الخصوص مہمند بر پشاور است۔ بہ وَجہ جنگ راہِ پشاور مسدود شدہ۔ از مدتِ دراز مردماں تنگ حال بودند۔ بدیں وَجہ جہلائے یاغستان از انگریز صلح نمودہ بودند۔ بدیں شرط کہ: ''اگر عسکرِ امیرالمؤمنین خلیفۂ رسول ربّ العالمین بر ہند رسید، ما باز بہ تُو صلح نہ داریم۔''

من دراں وقت رسیدم کہ جناب بابڑہ مُلّا صاحب برائے شکستاندن صلح در مہمند دورہ برائے تعزیر آغاز نمودہ بودند۔ و مولانا

www.rahimia.org

فضلِ ربیّ صاحب مہاجر ہمراہ شان بودند۔ آبلہ پائے چند روز بندہ را معذور داشت۔ زاں بعد دریں دورہ از شرفِ زیارت جناب مُلّا صاحب بابڑہ، و مولانا فضلِ (ربیّ) صاحب مہاجر مستفید شدم۔ مُلّا صاحب حسبِ رواج ایں ملک در سوختاندن خانہ ہائے آں مردماں — کہ برائے صلح پیشِ فرنگیاں رفتہ بودند — مصروف بودند۔ خانہ ہائے اکثر ملکان را خاک سیاہ ساخت۔

مُلّا صاحب و مولانا فضلِ ربیّ صاحب عجب غازی مرداں ہستند۔ مُلّا صاحب را دیدم کہ شان و تصرفِ عمرؓ ے دارد۔ عجب بے خوف و متوکل و دشمن کفارِ مسلماں است۔ آخر صلح شکستاندن .... (ایں جا نصف سطر غائب از عکسِ مسودہ است۔ مرتب)

(سفرِ کابل)

دریں جا آمدہ معلوم شد کہ ضرورت رفتن کابل است۔ مولوی فضلِ ربیّ صاحب چند مردماں مجاہدینِ کرام را از بُنیر آوُردہ، و چمرکنڈ جائے استقامت دادہ بود۔ ازیں یک شخص مولوی عبدالرحیم لاہوری معروف بہ بشیر را کابل روانہ کردہ بودند۔ اُو بندۂ خدا کارِ خود و جماعتِ خود کرد و بس۔ بلکہ ایشاں را فریب دادہ از سفرِ کابل باز داشت۔

آخر بندہ یک وفد مرتب نمودہ (از مولانا فضلِ ربیّ صاحب، و مولوی فضل محمود، و عبدالعزیز، و دو برادرانِ زن مُلّا صاحب بابڑہ، و یک مُلّائے مہمند) ہمراہ خود بہ صرفِ خود کابل بُردم در اوائلِ شعبان (۱۳۳۳ھ/ وسط جون 1915ء)۔

دریں جا از مولانا عبیداللہ صاحب (سندھی) مہاجر و از مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر و غازی شرفِ لقا حاصل شد۔ مولانا عبیداللہ صاحب بہ عزت در تمنا ہائے دراز حسبِ عادتِ خود مستغرق بودند۔ و مولانا سیف صاحب بر وظیفۂ دو ہزار سالانہ خود مقیم۔ دریں جا از مسٹر محمد ابراہیم صاحب ایم۔اے کرانچوی ہم ملاقات شد۔ ایں در کالجِ کابل ملازم و با مولوی عبیداللہ صاحب شریکِ تمنا ہا بود۔

(ملاقات بہ سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت)

بندہ از حاجی عبدالرزاق خاں صاحب غازی ملاقات نمود، وفد را ہم پیش کرد۔ اُوشاں بہ عزت مناسب پیش آمدند۔ و بندہ را و وفد را بہ حضور سردار نصراللہ خاں صاحب نائب السلطنت شائق غزائے پیش نمودند۔

(عرض مقاصد سلطان العلماء مولانا محمود حسن)

مضمون درخواستِ بندہ ایں بود کہ حضرت سلطان العلماء مولانا محمود حسن صاحب بدیں وَجہ — کہ فتح کردند ہند از دستِ کفار فرض است — ایں انتظام فرمودہ اند:

(۱) خدامِ خود را در علاقہ یاغستان روانہ کردہ اند۔

(۲) مولوی عبیداللہ را کابل۔

(۳) خود بہ حضور کاردارانِ خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین رفتہ اند۔

"(۴) بندہ را مع فرمان غالب پاشا والیٔ صوبہ حجاز و قائم مقامِ سلطانی روانہ ایں سفر فرمودہ۔

بدیں غرض کہ:

www.rahimia.org

(الف)　جنگِ حاضرہ علاقۂ یاغستان را بہ دولتِ افغانستان متحد کردہ۔

(ب)　و ایں مجموعہ را بہ سرِ یرِ خلافت متحد نمودہ، فریضۂ فتحِ ہند ادا کردہ شود۔

درباره کوائفِ یاغستان وفدِ یاغستان عرضِ حال خواہد کرد۔ و بندہ حاضر است کہ اگر در بابِ اتحاد باسریرِ خلافت شرائطے دادہ شوند، بندہ از راہِ ایران ایشاں را تا خدامِ خلافتِ عَلِیّہ رسانیدہ، بہ ذریعہ حضرت سلطان العلماء پیوستگی ہر دو دولتین پیدا نماید۔

وفدِ یاغستان کارِ جہادیہ، و پیدا نمودند دُشمنی با فرنگیاں، و دوستی دولتِ افغانستان در علاقہ یاغستان را بیان نمودہ۔ مراکز خود را از مہمند تا علاقہ آلائے — کہ متصل بہ کشمیر است — شماریدہ بود۔

نائب السلطنت از اراکینِ وفد مولانا فضلِ ربیّ صاحب، وعبدالعزیز، ومولوی فضل محمود صاحبان را چار چار صد سالانہ وظیفہ دادہ برکار یاغستان مقرر نمودہ۔ و دیگر اراکین را ہم وظائف دادہ امر کار کردہ رُخصت نمودہ۔ و بندہ را حکم اقامت کابل دادہ، وعدہ کرد کہ بعد از مشورہ امیر صاحب تُرا بدیں کار روانہ خواہم نمود۔ از بندہ ملاقات خاص در تخلیۂ تام نمود کہ بجز بندہ و حاجی عبدالرزاق خان صاحب دیگرے نہ بود۔

(ملاقات از اراکینِ سلطانی و جرمنی)

در زمانۂ قیامِ خود اوّل بہ جائے تگاؤ مُلاّ صاحب رفتہ، از یں شاں و از صوفی محمد جان صاحب ملاقات نمودم۔ و بعد ازاں از اراکینِ سلطانی و جرمنی؛ مسٹر فان ہنتک افسر جرمن، ومسٹر نیڈن مائر جرمن (سفیر) متعین ایران از راہِ چین روانہ شدہ بود۔ راجہ مہندر پرتاپ، و جناب برکت اللہ صاحب بھوپالی، و جناب موسیٰ کاظم بے موجود بودند۔ ارادہ ہائے شاں دربارۂ خدمتِ اسلام عالی بودند، لیکن سخت قیود دولتِ افغانستان مانع شاں بودند۔

(حالات امیرِ کابل و اُمرائے افغانستان)

اصل ایں است امیر (حبیب اللہ خان) صاحب کابل طبعًا دوست انگریزاں است۔ بوئے اِسلام وغیرت دراں نہ ماندہ۔ وقف عیاشی شدہ است۔ امّا نائب السلطنت (سردار نصراللہ خان) پُر غیرت مسلمان است۔ شوقِ جہاد دارد۔ وقتے کہ سفارت رسید نائب السلطنت در موافق کردن معین السلطنت عنایت اللہ خان کامیاب شد۔ پسرِ دیگر امیر صاحب مخاطب بہ معین الدولہ از اوّل موافق نائب السلطنت ہست۔ بدیں صورت امیر در رائے خود تنہا ماندہ، بے کار شد۔ و نائب السلطنت غالب شدہ در عام رعایا جوش پیدا نمود۔

(علماء ومشائخ افغانستان را غلط کردار)

لیکن امیر کار را در تعویق انداختہ، بنائے یک جرگہ علماء ومشائخ و اکابرِ سلطنت انداخت۔ و دریں فرصت بہ ذریعہ حضرت چار باغی یعنی معصوم ضیاء معین السلطنت (عنایت اللہ خان) را از نائب السلطنت (سردار نصراللہ خان) جدا نمودہ۔ جنبۂ اَش را ضعیف نمود۔ باز آہستہ آہستہ جوشِ رعایا را فرو ساخت۔ و یک رسالہ بہ نام ''اطاعتِ اُولی الأمر'' از جانب یک مُلاّ و زِ دستخط قاضیُ القضاۃ مُلاّ سعدالدین خان شائع کردہ، بر رعایا ظاہر کرد کہ:

''خلافِ امیر خلافِ اسلام است۔''

در بابِ حضرت چار باغی کسے نوشتہ است ؎

بیک باغی ہزاراں فتنہ خیزد

چہ ے باشد ، چوں باشد چار باغی

آخر الامر امیر (حبیب اللہ خان) غالب شدہ، کار را از دستِ نائب السلطنت گرفت۔

(مستوفی المما لک در بابِ یاغستان خرابی کردہ)

و در جوش یاغستان ہم بہ ذریعہ خادمِ خاص پیرِ فرتوت مستوفی المما لک (وزیرِ مالیات مرزا محمد حسین) فتور انداخت۔ سُفرائے سلطانی؛ حضرت کاظم بے، ومولانا برکت اللہ صاحب، یک تُرک ملازم افغانستان خیرالدین نامی، و یک عرب احمد آفندی را فرار بہ جانب تیراہ (آفریدی) کردہ۔ یک تحریکِ قوی قائم نمودہ بودند۔ و نائب السلطنت بہ طورِ مخفی ثابت نمودہ کہ بہ ایمائے دولتِ افغان ہم آمدہ اند، رُعب شاں را در آں جا قائم کردہ بود۔ مگر مستوفی (المما لک) ایں راز را فاش نمودہ، ایشاں را سبک، و تحریک را ضعیف ساخت۔ در مہمند و باجوڑ ہم رویہ دوستانہ امیر بہ کفار سستی نمودار شدہ است، مگر از مساعیٔ علمائے مہاجرین ایں جا و حسنِ نیت بابڑہ مُلّا صاحب کلی خرابی نہ شدہ است۔

(امیرِ کابل اراکینِ سفارت را از کابل کشید)

بعد از غلبۂ خود امیر اراکینِ سفارت را ہم از کابل کشید۔ راجہ (مہندر پرتاب) صاحب — بہ ایں خیال کہ از راہِ روس امریکا رَوَد — بہ جانب بلخ (مزار شریف) روانہ شد۔ و جناب مولانا برکت اللہ صاحب، و جناب کاظم بے صاحب بہ طرف ہرات در آخرِ ذی قعدہ ۳۴(۱۳)ھ (آخر ستمبر 1916ء) روانہ شدند۔ تاہنوز راجہ صاحب در مزار (شریف)، و مولوی صاحب و کاظم بے در ہرات ہستند۔ و حیثیت شاں حیثیتِ نظر بنداں است۔ گو عزتِ ظاہری مکّارانہ بسیار است۔

بہ وقتِ رفتن، امیر و معین السلطنت با سفراء ملاقات نہ کردند۔ نائب السلطنت دوستانہ رخصت نمود۔ دیروز آدم راجہ صاحب کپتان تیجا سنگھ بہ خیال نیپال از بندہ رُخصت شدہ است۔ دریں وقت از مزار آمدہ بود۔ راجہ صاحب بہ خیریت است۔ و بہ خیال رفتن از راہِ روس مقیم است۔ چوں کہ صلح روس با سلطان شد، اُمید رفتن قوی شد۔ ممکن است کہ کاظم بے ہم روانہ بہ راہِ روس شود۔ ارادۂ بندہ معیت حضرت کاظم بے بود۔ اوشاں ہم منظور کردہ بودند، مگر دولتِ افغاں راضی نہ شد۔ إنّا لِلّٰه ...۔

(سفرِ چمرکنڈ و علاقہ مہمند)

بعد روانگیٔ سفراء بندہ و مولوی سیف صاحب را ہم بدوں جواب رخصت نمودند۔ بندہ بہ عیدالاضحیٰ ۳۴(۱۳)ھ (8/ اکتوبر 1916ء) در چمرکنڈ علاقہ مہمند رسید۔ مولوی سیف صاحب در جلال آباد مقیم ہستند۔

(حاجی صاحب ترنگ زئی آغاز تحریکِ جہاد کردہ)

بعد از نمازِ عید بہ شرکت مُلّا صاحب بابڑہ و حاجی صاحب ترنگ زئی تحریکِ جہاد کردہ۔ قبائل مہمند، و ماموند، و چارمنگ، و دیگر

باجوڑ بعد از سخت جدوجہد در محرم ۳۵(۱۳)ھ (نومبر 1916ء) بہ مقابلہ ڈیری و چناری و مٹہ جمع شدہ۔ در روز ۱۷ر محرم الحرام (13ر نومبر 1916ء) غزے کردند۔ جنگ یک روزہ بود۔ چرا کہ ازیں زائد طاقت نہ دارند۔ دریں جا یک روپیہ فی کارتوس قیمت است و مردمان غریب۔ مجمع اوّل قریباً ۲۵ ہزار شدہ بود، مگر بہ وَجہ عدمِ تحمّل بسیار مردماں واپس شدہ۔ قریباً دہ ہزار شریکِ جنگ بودند۔ ایں مردماں اگر چہ تفنگ ہائے و کارتوسے خوب دارند، لیکن مقابلہ زیریزد توپ ہائے ۶، انجن و جہاز ہائے ہوائی، و مشین گناں موٹراں آہن پوش، و بم ہائے سُمّی، و ثباتِ شاں حیرت انگیز است۔

دریں جنگ اوّلاً انگریزاں سدّ تارِ برق ہم استعمال کردند۔ ازیں سبب مردمانِ غازی از غنیمت و حملہ محروم ماندند۔ از غزات ہشت شہید و دہ زخمی شدند۔ در زخمیاں یک غازی مشہور ملک مہمنداں کامل خان ہم بود کہ از تفنگ جہاز ہوا بر ران زخم خورد۔ الحمدللہ تعالیٰ! بعدۂ شفا یافت۔ از جانب انگریزاں روایات مختلف اند، لیکن اَقلّ ترین یک و نیم صد مقتول و مجروح اند۔ دو جہازِ ہوا بالکل از تفنگ غازیاں شکستند۔ یک انگریز و یک سکھ ہوا باز قتل۔ باقی سہ ۳ سخت مجروح شدند۔ و باقی جہاز خفیف مجروح شدند۔ کل جہاز ہشت و توپ خانہ ہائے خورد و کلاں چہار بودند۔ جنگ درمیدان ۲۵ میل طویل بود۔ درمیان دریائے کابل و دریائے صوات۔ دراں درمیان سدّ تارِ برق و خاردار قائم نمودہ بودند۔

علاوہ ایں غزے قریباً روزانہ ڈاکہ ہائے و بر سر علاقہ انگریز مے روند۔ و دریں ایں مردماں بسیار مہارت مے دارند۔ از تار برق گزشتن قابلِ تحسین۔ بعد از جہاد یک روز تار را بالکل برباد کردہ بودند، مگر بعد ازاں ایں قدر محکم تار آوردند کہ قوتِ مایاں بہ آں اثر نمے کند۔ مگر برائے آمد و رفت ڈاکہ جات ایں ہم مانع نہ شد۔

(سفرِ صوات)

بعد از فراغت از جہاد بندہ سفرِ صوات کرد، با کوہستان مُلّا پنج ماہ مغز زنی کرد۔ اُو بہ جائے جہاد، درمیانِ مسلماناں جنگ قائم کردہ است۔ صوات ماتحت نواب دِیر بود۔ از و کشید۔ و در صوات اثرِ انگریز غالب کرد۔ ارادۂ نواب دِیر بہ وَجہ اعلانِ سلطانی مخالفت انگریز بود۔ مگر حرکتِ کوہستانی قوتش را ضعیف نمود۔ تاہنوز ہم برائے خیال لشکر دارد۔ چناں چہ آغاز ہم نمودہ بود کہ مولانا فضل ربیّ صاحب، مولوی تاج محمد صاحب بی۔اے مہاجر، و مولوی کمال الدین آفریدی را فرستادہ، ازیں حرکتِ وے بازِ داشتند۔

(بندہ طریقۂ کارِ خود را تبدیل کردہ بود)

بندہ حالِ افغانستان بُرا دیدہ، طریقۂ کارِ خود را بہ ایں طور تبدیل کردہ بود کہ ہر تحریک از اسم مبارک اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کردہ شود، لیکن افسوس کہ حالتِ مالیٔ مالائقِ ایں کار است، نہ از خلافت قرب۔ بہرحال مردمانِ آلائی، بُنیر، و صوات، و باجوڑ، و مہمند را بریں امر تیار کردہ شد کہ بہ صورت آمدنِ مردماں اعلیٰ حضرت سلطان معظم امداد شاں خواہند نمود۔ دریں عہد مشائخ و علمائے بااثر و خوانین و ملکانِ ہر قوم شامل اند۔

دریں وَجہ بعد از اعلانِ سلطانی بہ مقابلہ انگریزاں ایں قدر حسبِ (ذیل) تحریکات خدام جنابِ والا شد:

(۱) جہاد در ۳۳(۱۳)ھ (1915ء) در بُنیر حسبِ تحریک حاجی صاحب ترنگ زئی۔

(۲) و جہاد در مہمند و باجوڑ در۳۳ (۱۳) ھ (1915ء) حسبِ تحریک جناب مُلّا صاحب بابڑہ و جناب مولانا مولوی فضلِ ربیّ صاحب مہاجرِ اوّل۔

(حالتِ جہاد در مہمند و باجوڑ)

وازیں جہاد پس مُلّا بابڑہ در مہمند مقیم ماندہ۔ چند ماہ سلسلۂ ڈاکہ ہائے قوی وحملہ ہائے مختصر قائم نمود۔ مولانا فضل ہم ہمراہِ شاں بود۔ تجویز شدہ بود کہ غزائے مسلسل شش ماہ قوی خواہد بود، مگر چوں کہ جاسوسانِ کفار در آب سمیات انداختہ بودند۔ بدیں وَجہ و بادریں قصد مانع شد، تاہم چند ماہ سلسلۂ ڈاکہ وحملۂ خفیف جاری داشتند۔ بعد از فرو شُدن۔

و باباز جمع شدہ در۳۳ (۱۳) ھ (1915ء) یک حملۂ عام کردند۔ مے گویند کہ: دریں غزے مجمع مجاہدین از پنجاہ ہزار ہم زائد بود۔ دریں جنگ مجاہدین از وبا، وحرب ہائے کفار چند صد شہید شدند۔ و ز کفار دو ہزار مشہور است کہ دراں یک رسالہ قریباً سالم است۔ تفنگ ہا، وکارتوس، وکرچھا وغیرہ اسباب درغنیمت آمد۔ مہمند در زدن رسالہ یدِطولیٰ دارند۔ بہ خلافِ آں دیگر یاغستانی کہ ایشاں از رسالہ مے ترسند۔ قبل ازیں خالص مہمنداں یک ڈاکہ کلاں بہ سرپرستی حکفور؟ حسبِ ماذون ہڈے مُلّا علیہ الرحمہ تعداد پانچ صد نفر بُردہ، انگریزاں را بسیار قتل کردہ، وغنیمت خوب حاصل نمودہ بودند۔ بعد ازاں سلسلۂ جنگ و ڈاکہ ہائے کم وبیش جاری بود کہ حاجی صاحب ترنگ زئی از تیراہ در مہمند آمدند۔ درغزائے محرم۳۴ (۱۳) ھ (نومبر 1915ء) ہمراہ بابڑہ مُلّا صاحب شرکت مے کردند۔ در وقتِ جہاد مولانا فضلِ ربیّ صاحب مہاجر آلائی و کشمیر برائے تحریکات رفتہ بودند، کامیاب آمدند۔ اگر وقت حملۂ ہند رسید، کار خواہد داد۔

(حدودِ یاغستان وحالاتِ اقوامِ اُو)

علاقہ یاغستان درمیان حدودِ ہند و افغانستان از وزیرستان تا آلائی ــــ کہ متصل بہ حدودِ کشمیر است ــــ طویل۔ از اقوامِ غیور افاغنہ۔ واسلحۂ جنگی تفنگ ہائے کارتوس ہر قسم دارند۔ تفنگ فوجی انگریز پانژدہ فیری ہم بسیار است۔ و قیمت از دو ہزار تا سہ ہزار دارد۔ وتفنگ جرمنی ہم باشد۔ و یک تفنگ آہن خوش غالباً بہم است۔ این ہم مثل جرمنی پنج فیری است۔ علاوہ ازیں انگریزی یک فیری بسیار است۔ وعلاوہ ازیں کارخانہ ہائے جرمنی تفنگ سازی ہم در تیرہ ومہمند بسیار اند۔ کہ دراں از یک فیری تا دَہ فیری مے سازند، مگر کارتوس ساختہ نمے توانند۔ البتہ خالی کارتوس را پُر مے کنند۔ آں ہم اعلیٰ نمے باشد۔ وکارتوس اگر انگریزی مے باشد، تفنگ ایں جا برابر انگریزی کار مے دہد۔ ایں مرداں بہ اعتبار معاہدہ انگریز و افغانستان (ڈیورنڈ لائن 1893ء) رعایائے انگریز اند، لیکن بہ وَجہ غیرتِ خود ایں حکومتِ انگریز وامیرِ (کابل) را دور داشتہ، آزاد اند۔

(علاقہ وزیرستان، تیراہ ومہمند وحالاتِ ملکاں)

علاقہ وزیرستان و تیراہ ومہمند درمیان خود حکومتِ خوانین ہم نہ دارد۔ برائے ہر دَہ (خاندان) یک ملک مے باشد۔ کہ اُو حسبِ رواجِ ملک فیصلہ قبول مے کند۔ یا علماء اثر مے دارند، مگر حکومت ہیچ کس رانمے باشد۔

(علاقہ باجوڑ وصوات وحالاتِ خوانینِ اُو)

وعلاقہ باجوڑ، وملیزئی (دِیر)، وصوات، وبُنیر، وچکیسر، کانڑا، غور بند وآلائی وغیرہ دربعض حصہ حکومت خوانین، وبعض حصص آزاد دارد۔ دریں خوانین قوی ترین نواب دِیر است۔ وشاداب ووسیع زمین شاہِ کاشکار (چترال)۔ از نواب دِیر ہم تعلق انگریزاں است۔ و دیگر خوانین ہم وظائف انگریز مے خورند۔ از علاقہ دِیر راہے بہ جانب گلگت و یارقند (چین) رفتہ است۔ عوض ایں دوازدہ ہزار وظیفہ از فرنگی مے خورد، لیکن ہمہ آزادان۔ وخوانین طبعاً میلان بہ جانب حکومتِ اسلامیہ وشوقِ جہاد دارند، لیکن مشکل ایں است کہ امیرِ (کابل) بے غیرت شدہ۔ وسلطان المعظم دور ہستند۔ واقعی بدوں امدادِ سلطنتے خود را از قبضہ فرنگ محفوظ داشتہ نہ۔ بہ ایشاں جنگ ہم کردن کارے است کہ ازاں رُجحان طبیعت شاں ہویدا مے شود۔

(چنیں قوم را بر رحمِ کفار گزاشتن سخت ناانصافی وگناہ است)

پس ایں چنیں قوم را بر رحمِ کفار گزاشتن سخت ناانصافی وگناہ است۔ صرف ازیں علاقہ کم از کم پنج لکھ فوج قاہرہ مرتب مے تواں شد۔ اگر دراں علاقہ آزاد بلوچستان ہم شامل کردہ شود — کہ از جانبِ وزیر دور نیست — باز تعداد نفری بسیار خواہد شد۔ و بلوچ از خلیج فارس متصل ہم است۔ بدیں وَجہ بہ صورتِ قبضہ خلیج تصرف یا تعلق بریں ملکِ طویل آسان است۔

در وقتِ حاضرہ صورتِ حال آں جا چیست دریں جا کسے را معلوم نیست، لیکن ایں ہویدا است کہ دریں وقت بہ وَجہ ناعاقبت اندیشی و بے دینی امیرِ کابل نقصانے کہ در اتحادِ اسلام رسیدہ، ازاں زائد ممکن نیست۔ پس جبر ایں لازم است۔ اگر دریں جنگ حق تعالیٰ ہند ومصر را بہ سلطان المعظم ارزانی فرمود۔

در وقتِ حملۂ ہند — اگر دریں علاقہ یاغستان افسرانِ جنگی وسامانِ جنگ مختصر ہم بہ رسد — بسیار مفید خواہد بود۔ دریں جا ہر فرد فوج است، حتیٰ کہ زناں ہم جنگی ہستند۔ اطفال دَہ سالہ را در جنگ دیدم کہ در صفوفِ اولیٰ جنگ مے کردند۔ و پنجاہ سالہ دریں جا جوان است۔

(برائے احیائے ایشیائے متوسطہ لازم است)

اگر ایں ممکن نہ باشد وخدانخواستہ ہند ہم در کفر ماند، باز برائے احیائے ایشیائے متوسطہ لازم است کہ در معاہدہ کُل یاغستان را در حقِ خود گرفتہ، و راہے مناسب برائے یاغستان ہم فیصلہ نمودہ۔ حضرت خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین مدبرین وسامان احیائے ایشیائے وسطی دریں جا روانہ فرمایند۔ ورنہ احوالِ افغانستان و ہندوستان ظاہر است۔ و بعد از جنگ ازیں ہم بدتر خواہد بود۔ باز مسلمانانِ ایشیائے وسطی را خدا حافظ است۔

یاغستان اگر درون است مدبرینِ اسلام باشد ایں ہم رُتبہ افغانستان در ایشیائے وسطی دارد۔ ازیں در ہند وچین وغیرہ وخود افغانستان حرکتے پیدا تواں کرد۔ اگرچہ درمیانِ ہند وافغانستان قیام بہ وَجہ انگریز وامیرِ (کابل) از دشواری ہا خالی نیست، لیکن ناممکن نیست۔

(افغانانِ یاغستان نظامے مشابہ جمہور دارد)

اگر افغانانِ یاغستان در قبضہ باشند، قوم طباع ثابت خواہند شد۔ باوجود عدمِ حکومت و جنگ و اختلافاتِ باہمی درمیانِ خود نظامے مشابہ جمہور دارند۔ و ایں قدر اسلحہ فراہم کردہ اند کہ باوجود گرانیٔ سخت بسیار قابلِ تعریف است۔ و خود بندوق سازی ہم آغاز کردہ اند۔ واقفین مے گویند کہ: تفنگِ یاغستان، تفنگِ کارخانۂ امیر (کابل) بہتر مے باشد۔ مشین گن ہم ساختند، مگر بہ وَجہ عدمِ پختگی فولاد مے کفد۔ در دِیر دریں وقت توپ ہائے کہنہ را تعدادی تا چہار۔ کارتوسے ساختند۔ اگر چند اعلیٰ کاریگر دریں جا بہم رسند، کار خوب دریں جا شائع خواہند کرد۔

(معدنیاتِ مُلکِ یاغستان)

مُلک از کان ہائے مختلف پُر است، لیکن دریں جا نہ کان شناس است، نہ کان کُن۔ علاقہ امیرِ (کابل) ہم برین حال است۔ کانِ آہن اکثر جا در یاغستان ظاہر است۔ و آہن گراں بہ دِقّت از گِل آں چیزے حاصل مے کنند، مگر بہ وَجہ عدمِ علم معذور اند۔ اگر سرمایہ دریں مُلک صَرف نمودہ، اُمید کامیابی است انشاء اللہ تعالیٰ۔

(بندہ از خوانین وعدۂ تحریری، اعانتِ خدامِ سلطانی گرفتہ)

بندہ از مہمند تا صوات خود سفر نمودہ و ز خوانین آلائی بہ ذریعۂ دیگر معززین معرفت نمودہ۔ وعدۂ تحریری اعانتِ خدامِ سلطانی گرفتہ است۔ و یک نمونۂ مختصر ہمراہ عریضۂ ہٰذا بر پُشت نقل نامۂ غالبے ارسال مے کنم۔ علاوہ ایں تحریر تحریرِ مفصل ہمراہ بندہ است۔

اگر فضلِ خداوندی شاملِ حال است ہمراہ خود خواہم آورد۔ در حاضری بندہ تاخیر شد، مگر از کرمِ خداوندی تجربہ ہائے مفیدہ حاصل شدند۔ و دریں وقت ہم در حاضری عوائق ہستند، لیکن اُمید است کہ منتج خیرات برائے اسلام و خلافتِ اسلام خواہند بود انشاء اللہ تعالیٰ۔ و زود ختم خواہد شد۔

(دریں جا غوغا است انقلابِ روس)

دریں جا غوغا است کہ در روس شاہ معزول شد۔ پارلیمنٹ قائم شدہ۔ بہ حضرت سلطان المعظم صلح نمودہ۔ قفقاز حوالۂ شاں نمود۔ ایران و بخارے را آزاد نمود۔ ازیں خبر دریں جا موجہائے امید ہا پیدا شد۔ مگر حالِ امیرِ (کابل) ہموں طور است۔ اگر ایں خبر حق است باز از راہِ روس توقع از باری تعالیٰ صورت حاضری دارم۔

(حالات مُلکِ صوات)

دو کلمہ در بارۂ صوات کہ دریں ملک ہم عرض کردنی است۔ ممکن است کہ در راہ کار آمدہ ہست۔ ایں ملک مثل قبائلِ عرب در جفاکشی، عصبیت و آزادی ہست۔ البتہ ایں مرداں از نامِ کفر مے ترسند۔ عالمے کہ ایں را بگوید کہ: ''اگر ایں چنیں نہ کردید کافر خواہید شد'' باز خلافِ آں نے کنند۔ اثر علماء و مشائخ محض ہمیں سبب است۔ و دریں امرِ خاص قومِ مہمند از ہمہ فائق تر است۔ در وزیر ہم ایں کیفیت است۔ و در تیراہ بہ اثر انگریز طمعِ دُنیاوی باعثِ کار شدہ است۔ اما ایں ہر سہ اقوام در وفائے عہد مشہور اند۔ در

www.rahmia.org

وزیر و مہمند زراعت برائے ملک کافی است، مگر در آفریدی کم است۔ و باقی ملک در عہدِ وفا نمبر دوم است، لیکن از خدامِ سلطانی نافرمانی ازیں شاں ہم متوقع نیست۔ وعلیٰ الخصوص وقتے کہ خدام با سامان و مدبر باشند۔

در ہمہ علاقہ جات زیرِ حکومت خوانین باشند یا آزاد علاقہ اتباعِ دینی ادب سادات علیٰ الخصوص اولاد حضرت (شیخ عبدالقادر) جیلانی علیہ الرحمہ بسیار است۔ و در مشائخ دریں جا علاوہ معمولی نماز و روزہ بجز لنگر حاجت دیگر کمالات نیست۔ اگر پانچ صد روپیہ ڈبل ماہوار در لنگر صَرف داشتہ باشد ازاں کلاں شیخ متصرف دِگر نہ خواہد بود۔

(پس صورتِ کار ایں است)

پس صورتِ کار ایں است کہ:

(الف) یک عالم پشتو دانی سیّد از اولاد حضرت جیلانی اگر باشد، خوب است۔ مع چند مریدین باسلیقہ دریں جا آمدہ بہ ذریعہ سلسلۂ لنگر قبضہ کند۔

(ب) و چند مدبرینِ دیگر مگر بہ صورتِ پابندِ شرع دریں جا آمدہ، بہ ذریعہ مُشائخ معتبرین ایں جا معرفت در اقوام و خوانین قائم نمودہ، حسبِ مصالح مقام کار کنند۔

(ج) آزاداں ایں جا را اگر نفعِ دینی و صورتِ رفعِ نزاعات کسے پیش کند عشرے دہند کہ عشر ایں جا نا کافی است۔

(د) اگر صورت بر آوردن معدنیات شود آمدنی بسیار خواہد بود۔ علاقہ صوات، وملیزی (دِیر)، و چترال بسیار شاداب علاقہ جات ہستند، مگر اصل ایں است کہ ما را اوّل سرمایۂ کامل دریں جا صَرف کردنی است۔ بعد ازاں فائدۂ آں حاصل توانیم کرد۔

وایں ہمہ بحث محض دراں صورت است کہ ہندوستان در دستِ سلطانی نیاید۔ و باز ضرورت احیائے ایشیائے وسطی پیش آید۔ اگر در یاغستان صورتِ تہذیب پیدا شد در افغانستان بہ وَجہ آمد و رفت وتعلقاتِ قومیت حرکت لازم است۔

(مرد ماں مخلص؛ برائے منافعِ ذاتیہ را کار برباد نمے کنند)

دریں نواح مشائخ بسیار اند، مگر دریں کار مُلّا صاحب بابڑہ و مولانا فضلِ ربیّ واسطہ کارِ ما خواہند بود۔ ایں مرد ماں نہایت مخلص وز منافعِ ذاتیہ کار را برباد نمے کنند، بہ خلاف دیگر صاحبان۔ واعتبار و رُعب مُلّا صاحب بابڑہ بہ وَجہ اخلاص و قدامت از ہمہ مشائخ در علاقہ مہمند، و باجوڑ، وصوات زیادہ است۔ و در دیگر علاقہ جات ہم کار کردہ مے تواند۔

(امور لازم بر مدبرین)

مدبرین کہ خود را دریں کار وقف سازند او شاں را لازم است کہ:

(الف) فی الفور پشتو شروع کنند۔

(ب) وفرض کنند کہ حلقہ ہائے کار چہار ۴ اند:

(۱) وزیر (وزیرستان) (۲) تیراہ

(۳) مہمند و باجوڑ ملیزئی (دِیر) (۴) صوات، بُنیر و آلائی وغیرہ۔

(ج) از مدبرین یک اعلیٰ و چہار ماتحت لازم اند:

(۱) و ہر جا یک ناظمِ تعلیم (۲) یک معلمِ جنگ

(۳) یک کان شناس (۴) انجینئر و اسلحہ ساز، و بم و ڈائنامنٹ ساز وغیرہ ضروری اند۔

اگر حضرت خلیفۂ رسولِ ربّ العالمین در احیائے ایشیائے وسطی کامیاب شدند، منافع ہائے وے از اندازہ بیرون برائے کل عالمِ اسلام خواہند بود انشاء اللہ تعالیٰ۔ برائے متحرک نمودن افغانستان — کہ اُو اصل مرکز ایشیائے وسطی است — ایں ضروری است کہ ازاں خارج مگر متصل حلقۂ کار مقرر نمودہ شود۔ اگر در عین قبضۂ وے کار کردہ شود، ایں از عوائق گوناں پُر خواہد بود۔

در یاغستان معرفت و اعتبارِ خدام و انصارِ شاں ایں قدر پیدا شدہ است کہ دریں خدمات بسیار سہولت پیدا خواہند کرد۔ اگر از مزید احتیاط یک مدبر اوّل برائے ملاحظۂ احوال روانہ نمودہ، بعد از اطلاع دادن دوے باقی انتظامات نمودہ شوند، خوب خواہد بود۔

بہترین امر بہ حالتِ موجودہ ایں است کہ ہر سعیٔ امکانی برائے حملۂ ہندوستان نمودہ شود۔ اگر ایں شد باز از یاغستان و ہندوستان امداد کافی انشاء اللہ تعالیٰ حاصل خواہد شد، بلکہ افغانستان را ہم دراں وقت سکوت متعذر است۔ چہ کہ کل عملہ و رعایا خلافِ سکوت است، مگر بہ وَجہِ قبضۂ شخصیۂ امیر (کابل) و دور بودن قوتِ خلافت مجبوراً ساکت است۔ رعایائے افغانستان ہم مسلح بہ تفنگ ہائے جدیدہ است۔

وزیر و تیراہ باہم متصل اند۔ در تیراہ و مہمند علاقہ شَوار (کہ تحتِ امیر است مگر نیم آزاد) حائل است۔ باز تا آلائی ہمہ علاقہ یاغستان پیوستہ است۔ صرف در علاقہ دِیر راہِ گلگت و یارقند کہ از انگریز است رفتہ است۔ مگر براں تصرف نامۂ نواب دِیر است انگریز تصرفات نہ دارد۔

(سخن در بابِ سفارتِ سلطانی و جرمنی)

در بابِ سفارتِ سلطانی و جرمنی سخن آمد، ترتیب سفارت بہ ایں معنی — کہ از یک افسر تُرک و جرمنی، و ز یک مسلمان و یک ہندو ہندوستان مرتب بود۔ و ہمراہ وے چند افغانان ہم بودند — خوب است، لیکن نقصان ایں بود کہ غالباً سرمایہ ہمراہ سفارت محض جرمنی بود۔ و ایں کہ عنصر مذہبی و علمی دراں نہ بود۔ در ایشیائے بہ وَجہِ بُعد از یورپ مذہب چنداں کہ اثر دارد۔ سخنانِ سیاست رائج نہ دارند۔ اگر چند علمائے دینی ہمراہ بودہ بر علمائے افغانستان فرضیتِ غزا دریں وقت و فرضیتِ اطاعتِ خلیفہ و خلافتِ عثمانیان ثابت کردندے خوب مؤثر بود۔

بعد ازں وقتے کہ مسٹر فان ہنتک سفیر جرمنی فوائدِ قومِ خود نہ دیدہ، واپس شد۔ و ہمراہی باقی رُفقاء نہ کردہ۔ کل سرمایہ ہمراہ خود بُرد۔ باز از خالی دست باقی ماندگان چہ مے تواں شد۔ حالتِ شاں 'نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'۔ از وجوہ بے اثری سفارت اختلاف فان ہنتک از رفقائے خویش آثارِ قویہ ثابت شد۔ اگر راجہ (مہندر پرتاپ) صدرِ سفارت بود، اطاعتِ وے لازم بود۔ بہر حال برائے تحصیلِ فوائدِ خلافت لازم بود کہ از سرمایۂ خود بہ صدارتِ مسلمان بہ عنصرِ علمی و سیاسی سفارت روانہ مے کردند۔ و دراں

www.rahimia.org

از مشاہیرِ قومِ عثمان فردے لازم بود۔ باز لازم بود کہ ازاں مردماں زور آور در یاغستان کہ سامانِ وجاہت داخل شدہ کارے کردند۔ اگر وقت مکافات باشد، مکافات مفید خواہد بود۔ إن شاء اللّٰہُ تعالیٰ۔

(باقی احوال از یاغستان)

از احوالِ یاغستان ایں باقی ماند کہ از وَجہِ خیرالدین آفندی و احمد آفندی در تیراہ حرکتے پیدا شدہ چند ڈاکہ ہائے بسرِ انگریز شدند۔ وقوم کوکی خیل علمِ سلطانی را قبول کرد۔ بہ وَجہِ مخالفتِ امیر و سیاستِ انگریز ازاں زائد نہ شد۔ در تیراہ چوں کہ اکثر شان ملازم در فوجِ انگریز اند، فوج نظام بالکل مرتب موجود است۔ صرف عدمِ سرمایہ مانع کار است۔ تیراہ از یک لکھ زائد فوج نظام مرتب مے تواں داد۔

(دریں وقت وزیر قبائل با انگریز بسرِ جنگ)

در وزیر ہم فوج مرتب موجود است، و دریں وقت وزیر با انگریز بسرِ جنگ است۔ جنگ مستقل صورت گرفتہ است۔ در اخباراتِ انگریزی نامش ''میدانِ جنگِ وزیر'' نہادہ شدہ است۔

سبب ایں شد کہ از ریاست کاٹ کہ متصل وزیر، در قبضۂ انگریز بود چندۂ جنگ طلب کردہ شد۔ رئیس چندہ نا دادہ، پسرانِ خود را در وزیر فرار نمودہ۔ عذر کرد کہ: ''پسرانِ ما فرار شدہ اند۔ وخوف است کہ از تحریکاتِ شاں حملہ بر سرِ شما شود۔ پس مرا معذور دارید۔ برائے ما ایں خدمت کافی است۔ کہ شما را از ایذائے وزیر محفوظ دارم۔'' انگریز شبہ ناک شدہ، رئیس را گرفتار کرد، و ریاست را ضبط نمود۔ پس پسرانِ رئیس تحریکات آغاز نمودہ، جنگ بر پا نمودند۔ در آغازِ جنگ یک جرگہ وزیریان آمد کہ ما پسرانِ رئیس حوالہ شما مے کنیم، و مردماں بہ تعدادِ کثیر تفنگ ہائے مخفی ہمراہ آوردند۔ در قلعۂ سرحد بنوں جرگہ بود۔ داخل شدہ بر ہمہ قلعہ و سامانِ جنگ قبضہ نمودہ۔ انگریزاں را قید بردند۔ جنگ سہ چہار شدہ اند۔ و دراں بسیار نقصانات فرنگی شدہ اند۔

دریں جا اخبار بالکل میسر نہ مے شود۔ از آئندگانِ پشاور ایں احوال معلوم مے شود۔ و آں ہم گاہ گاہ۔

بدیں وَجہ فرنگی از مہمنداں باز اظہار آشتی مے کند۔ چناں چہ برائے مہمنداں را ہم اکثر پشاور آزاد نمودہ است، و رعایت ہا کردہ است۔ ومہمنداں بہ وَجہِ تکالیف سہ سالہ وسکوتِ امیر (کابل) وعدمِ اعانت از جانبے ایں امر را منظور نمودہ اند۔ بدیں شرائط کہ:

(الف) ما مزاحم ڈاکہ جات نہ خواہیم شد۔

(ب) مخالف دشمنانِ شما نہ خواہیم شد۔

(ج) و در صورتِ حملۂ سلطانی بہ سرِ ہند حملہ بہ سرِ شما خواہیم کرد۔

(جنگِ مہمند)

جنگِ مہمند کہ در اخبارات شائع مے شود، دراں محض مہمنداں نمے باشند، بلکہ حصۂ غالب از قومِ ترکانی کہ: چارمنگی و ماموند و سالارزئی وشموزئی وغیرہ ہستند۔ وخود خوانین چارمنگ شریک مے باشند۔ خوانین چارمنگ مشہور غازیان اند۔ در خان ہائے خود چند چند شہدا دارند۔

www.rahimia.org

(قومِ ماموند مشہور دشمن انگریز)

وقومِ ماموند مشہور دشمن انگریز است۔ در چارمنگ و ماموند ہیچ کس علانیہ وخفیہ وظیفہ خوار انگریز نیست۔ و در مہمند بعض مرد ماں علانیہ ہستند۔ ایں ہر دو اقوام در علاقہ انگریز پوشیدہ مے روند۔ ظاہر گاہے نمے روند۔ وَجہ شہرت مہمند ایں است کہ در اسلحہ ایشاں فائق و جنگ در محاذ مہمند مے شوند۔ ورنہ مہمند کہ جنگ مے کنند بہ وَجہ پشت پناہی ایں اقوام مے کنند۔ ایں اقوام در باجوڑ آباد اند۔ از مہمنداں غیور تر اند۔ جنگِ مہمنداں حملہ آور نہ نمے باشد۔ وایں اقوام تفنگ وتوپ را ہیچ نمے فہمند۔ راست بسرِ توپ وتفنگ مے روند۔ ہاں! در وفائے عہد اطاعت وخوبیٔ اسلحہ مہمند فائق تر اند۔ بہ وَجہ سادگیٔ معاشرت سپاہی دریں جا از ہندوستان ہم ارزاں است۔ و برائے جہاد صرف نانِ جویں وکارتوس تفنگ کافی است۔ در پیادہ روی از خچر ہم زیادہ جفاکش ہستند۔ در علاقہ کوہستان از اذانِ صبح تا عشاء سفر کردہ مے توانند۔

(در ہند گرفتارانِ تحریک)

در ہند مولوی صادق کراچی، مولوی حمد اللہ صاحب، مولوی احمد صاحب، پیر صاحب دین پور مع دامادِ خویش، حسرت موہانی، ابوالکلام (آزاد)، مولوی احمد علی (لاہوری) خویش مولوی عبید (اللہ سندھی)، مولوی عبداللہ (لغاری) سندھی را انگریز مقید نمود۔ از باقی احبابِ ما ضمانت گرفت۔ مولانا خلیل و مولوی مرتضٰی را ہم لیفٹینٹ در منصوری طلب نمودہ بود، مگر از سفارشِ احبابِ انگریز (مہتممینِ مدرسہ دیوبند ومولوی شبیر احمد) نجات یافتند۔

(نامہ ہائے سہ ارسال کردہ ام)

درسالِ گزشتہ (۱۳۳۴ھ/1916ء) سہ نامہ ہا روانہ کرد:

(۱) یک: بہ ذریعہ حجاجِ ہند (مکتوبہ مؤرخہ ۸/رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ 9/جولائی 1916ء)۔ احوالش معلوم نہ شد۔

(۲) دوم: بہ ذریعہ سفارت از جانب حکومت مؤقتۂ ہند از راہِ روس ارادۂ چین وامریکا داشت۔ اُو در روس گرفتار شدہ بہ دست انگریز آمد۔ انگریز سزائے موت دادند۔ دراں یک مسلمان از طلبائے مہاجرینِ ہند مولوی عبدالقادر شہید ایم۔اے بود و یک سکھ۔

(۳) سوم: بہ دست مولوی محمد برکت اللہ صاحب سفیر خلافتِ علیّہ۔ ایشاں در ہرات بند ہستند۔

(در کابل ''حکومتِ مؤقتۂ ہند'' مرتب شدہ)

راجہ صاحب مہندر پرتاپ صدر سفارتِ جرمنی و ترکی و مولوی برکت اللہ صاحب سفیرِ خلافت و مولوی عبیداللہ صاحب (سندھی) مہاجر ما یک ''حکومتِ مؤقتۂ ہند'' (پرووِیژنل گورنمنٹ) مرتب نمودہ اند۔ راجہ پریسیڈنٹ۔ مولوی برکت اللہ صاحب وزیراعظم، مولوی عبیداللہ صاحب وزیرداخلہ مقرر شدہ اند۔ از سیکرٹریانِ وزیر داخلہ بندہ ہم است۔ چوں کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند یک مرکز در یاغستان و دو مرکز بہ جانب نیپال تجویز نمودہ است۔ بدیں وَجہ کارِ اقامتِ مرکز یاغستان سپردِ بندہ شد۔ دریں جا مصالحۂ مرکز تیار است، مگر محض از وعدہ ہائے دراز قائم نمے شود، سامان باید۔

www.rahimia.org

(فوائد ونقصانات حکومتِ موَقتۂ ہند)

ایں حکومت بہ ایں وَجہ خوب است کہ از ہنودِ ہند آشتی باشد، مگر برائے فوائدِ اسلام مُضِر است۔ چرا کہ تا ایں وقت کہ اظہار خیالات شدہ اند، دراں فوائد ہنودِ ہند ملحوظ اند وبس۔ و چوں کہ راجہ (مہندر پرتاپ) بہ خیال چین و جاپان، امریکا و روس و دیگر مما لکِ یورپ رفتہ، و اُو را اختیارِ کلی برائے معاہدات با دُوَل از جانبِ حکومت دادہ شدہ است۔ بدیں وَجہ حفاظتِ مفادِ اسلام ممکن نیست۔ بہ تجربہ بارہا رسیدہ است کہ اغیار از ما فوائد حاصل نمودہ، باز ما را تباہ نمودہ اند۔ ما را محض قوتِ ما کارآمد شدہ است۔ قوتِ دیگراں دیگراں را کارآمد است و ما را مُضِر۔ بدیں وَجہ عقل مندی ہمیں است کہ پیشِ نظرِ ما مفادِ اسلام وخلافت باشد۔ و رویّہ ما صرف مرنجان ومرنج باشد۔ دریں وقت دیگراں را از رعایات مالا مال کردن، آسان است، مگر من بعد از عواقبِ آں محفوظ ماندن سخت دُشوار است۔

مقصد ہنود محض حکومتِ ہند بغیر شرکتِ غیر است۔ دریں وقت اوشاں بہ مددِ اسلام اُو را حاصل نمودہ۔ باز اسلام را از ہند خارج خواہند کرد۔ ''ہندوستان برائے ہنداواں است'' ایں مقولۂ اوشاں است۔ ایشاں برملا مے گویند کہ:

''فرنگیان در ملکِ فرنگ، ومسلمانان در ریگستانِ عرب بہ روند، کار اوشاں در ہند چیست۔''

اگر سلطنتِ اسلامیہ از بیرون آمدہ قبضہ بر ہند کند، باز قوتِ بیرونی واندرونی مسلمانان برائے حکومت کافی خواہد بود۔ ہاں! ما را از رعایتِ واجبی وحسن سلوک احتراز نیست۔ قوتِ اغیار ومراعاتِ زائد بہ کفار چہ اثر دارد۔ تجربہ ایں دریں زمان از خلافت دیگرے را زیادہ نیست۔

(فہرستِ مراکز روانہ عریضہ ہذا مے کُنم)

بندہ از دفترِ افغانستان متعلقہ کارِ یاغستان (سرحد) چند ضروری اطلاعات بہ طورِ مخفی حاصل نمودہ است۔ ازاں یک نقل فہرست مراکز بہ ذریعہ روانہ ہمراہ عریضہ ہذا مے کنم۔ ایں اندازہ نفری مددگار کم از کم است۔ علاوہ ازیں کل فہرست وظیفہ خواران افغانستان ہم ہست۔ اگر حق تعالیٰ مدد نمود ہمراہ خود مع رپورٹ ہائے خفیہ واحوالِ یاغستان خواہم آورد۔

حامل عریضہ ہذا آدم مولوی فضلِ ربیّ صاحب وآدم کاراست۔ جانِ خود را فی سبیل اللہ وقف نمودہ است۔

بہ خدمت جملہ خدام سلام مسنون عرض است والتجائے دعا۔

دریں جا نام بندہ ''منصور'' است۔ و بخارے مُلّا ہم مے گویند۔

مؤرخہ ۱۵رشوال المکرّم ۱۳۳۵ھ (4راگست 1917ء)

حواشی

1۔ مولوی فضلِ ربیّ صاحب مہاجر و غازی: ان سے مراد مولانا فضلِ ربیّ عرف ابوالفتح ولد محمود ہیں۔ ان کا آبائی وطن تھانہ شنکیاری، ضلع ہزارہ تھا۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۲۷ھ/ 1909ء میں دورۂ حدیث کرکے تعلیم سے فراغت حاصل کی تھی۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے یاغستان ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ ''ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ اس طرح تحریر ہے: ''یہ پہلے حاجی ترنگ زئی کے قائم کردہ مدرسہ مقام غدر تحصیل مردان میں معلم تھا۔ 1918ء میں ایک جلسے میں ـــــ جسے غدر سکول کے لیے روپے جمع کرنے کے واسطے طلب کیا گیا تھا ـــــ اس نے نہایت قابلِ اعتراض تقریر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فضلِ ربیّ حال ہی میں دیوبند کے مدرسے کا متعلّم ہوا تھا، جہاں مولانا محمود حسن کا پکا مرید بن گیا تھا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ محمود حسن نے اسے مولوی سیف الرحمٰن اور فضل محمود وغیرہ کے ہمراہ جہاد کی تبلیغ کے لیے آزاد علاقے کو بھیجا تھا۔ 1915ء کی بہت سی لڑائیوں کا یہ ذمہ دار ہے۔ جون 1916ء میں فضلِ ربی، فضل محمود اور عبدالعزیز یاغستان میں انجمن حزب اللہ کے نمائندے کے ہمراہ حاجی ترنگ زئی کی طرف سے خفیہ مشن پر سردار نصراللہ خان سے ملاقات کرنے کابل گیا تھا۔ دس بارہ دن کے بعد واپس آ گیا تھا۔'' (تحریکِ شیخ الہند انگریزی سرکار کی زبان میں، ریشمی خطوط سازش کیس اور کون کیا تھا؟، ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری 1917ء، شخصیت نمبر 79، ص421، مرتبہ مولانا سیّد محمد میاں، طبع مکتبہ محمودیہ، کریم پارک، لاہور)

تحریکِ ریشمی رومال کے بعد مولانا فضلِ ربیّ افغانستان چلے گئے تھے۔ وہاں وہ حکومتِ افغانستان کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے تھے اور مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ وہ جمعیت علمائے افغانستان کے ایک ممتاز رُکن تھے۔ ان کی عمر کا بیش تر حصہ علمی اور سیاسی خدمات میں گزرا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:2، ص102-03)

2۔ مُلّا صاحب بابڑہؒ: ان کا اصل نام سیّد امیر جان تھا۔ ان کے والدِ گرامی عبدالرحمٰن سالارزئی تھے۔ مُلّا صاحب وادیٔ چارمنگ کے ایک گاؤں لبنائی میں 1855ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک عالم دین ''ماما صاحب'' سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر دیگر علمائے دین سے بھی کسبِ فیض کیا اور دینی علوم کی تکمیل کے بعد حضرت نجم الدین ہڈے مُلّا صاحبؒ خلیفہ حضرت اخوند عبدالغفورؒ سواتی ''سیدو بابا'' کے خلیفہ سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں بیعت ہوئے اور طریقت اور سلوک کی تکمیل کے بعد اُن سے خلافت اور اجازت حاصل ہوئی۔ اور اپنے مرشد کے انتقال 1902ء کے بعد اُن کے جانشین ہوئے۔ چوں کہ حضرت نجم الدین ہڈے مُلّا انگریز سامراج کے خلاف جہاد میں رہتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مرشد کی تقلید میں ساری عمر انگریز کے خلاف جہاد میں گزار دی۔ مہمند اور باجوڑ کی لڑائیوں میں انھوں نے بڑی شجاعت اور بہادری دکھائی، جس کی وجہ سے وہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ (تذکرہ سرفروشان صوبہ سرحد، از محمد شفیع صابر، ص145 تا 151، طبع یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور) ان کے متعلق تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق مقدمے کی ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں تحریر ہے: ''عبدالرحمٰن سالارزئی بابوکٹڑہ باجوڑ کا لڑکا ہے۔ سالارزئی اور مہمند قبائلیوں میں بااثر ہیں۔ عمر 66 سال ہے۔ بڑا فسادی اور سرکش مولوی ہے۔ 1915ء میں ابتداءً جہاد سے انکار کیا، لیکن جب حاجی ترنگ زئی نے طعنہ دیا تو 10 ہزار مہمندوں کے ساتھ شبقدر پر ستمبر 1915ء میں حملہ آور ہوا۔ اس کو ''جان صاحب'' بھی کہا جاتا ہے، لیکن اس پر جان صاحب باجوڑ کا شبہ نہ ہونا چاہیے۔'' (شخصیت نمبر 41، ص416) انھوں نے جن معرکوں میں انگریز کے خلاف حصہ لیا، اُن میں ''لکڑاؤ کا جہادؔ''، ''الکنڈی کا جہادؔ'' اور ''عقرب ڈاگ کا جہادؔ'' بہت مشہور ہیں۔ اُن کے ساتھ جہاد میں اُن کے پیر بھائی حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی بھی شریک رہے۔ وہ جمعیت حزب اللہ کے اہم ترین رُکن تھے۔ اس طرح حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بھی اُن کا بڑا گہرا تعلق رہا۔ ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔

3۔ حضرت نائب السلطنت سردار نصراللہ خان: والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے چھوٹے بھائی ہیں، جو افغانستان میں ''نائب

www.rahimia.org

السلطنت'' کے عہدے پر فائز تھے۔

4۔ حضرت غالب پاشا: یہ خلیفۂ عثمانی سلطان محمد رشاد خان خامس کی جانب سے حجاز کے والی اور گورنر تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ان سے مکہ مکرمہ میں حج کے موقع پر ذوالحج ۱۳۳۳ھ/ اکتوبر 1915ء میں ملاقات کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے والیٔ حجاز اور قائم مقامِ اعلیٰ خلیفۂ عثمانی کی حیثیت سے ۱۹/ ذوالحج ۱۳۳۳ھ/ 28/ اکتوبر 1915ء کو ہندوستان کے عوام کے نام ایک فرمان جاری کیا تھا، جسے ''غالب نامہ'' کہا جاتا ہے۔ اس فرمان میں انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ میں حضرت شیخ الہندؒ سے پورا تعاون کرنے کا حکم تحریر کیا تھا کہ: ''تمھیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ قابلِ احترام مولانا محمود حسن — جو ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے سابق اُستاذ ہیں — نے ہم سے رجوع کیا ہے اور ہم نے باہمی مشورہ کیا ہے۔ اور اُن کے ساتھ اس اہم کام کے سلسلے میں ہم نے مذاکرات کیے ہیں اور آپس میں قراردادیں منظور کی ہیں۔ میں نے انھیں اس سلسلے میں ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ چناں چہ ہماری طرف سے اُن پر مکمل اعتماد ہے (اور اُن کے حوالے سے) ہر اُس شخص کے لیے اعتماد ہے، جو اُن سے تعلق رکھے، خواہ وہ کوئی عام شہری ہو یا جنگی اور عسکری خدمات سرانجام دینے والا ہو۔ یا جسے وہ کوئی کام سپرد کریں۔ اس لیے تمام لوگ اُن کی پوری پوری معاونت کریں، جتنا کسی کام کا تقاضا ہو۔'' (غالب نامہ)

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جدہ کے بعد کی تفصیل بتاتے ہوئے عبیداللہ نے حضرت مولانا کو جو خط لکھا ہے، اُس میں لفظ غالب سے مراد غالب پاشا ہے، جو حجاز کا ترک فوجی گورنر تھا۔ اس کی شہرت اس وقت ہوئی جب اس نے ہندوستانی زائرین سے اصرار شروع کیا کہ وہ اپنے ہم وطنوں میں جہاد کی تبلیغ کریں۔'' (شخصیت نمبر82، ص422)

5۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب: ان سے مراد مولانا سیّد مرتضیٰ حسن بن حکیم بنیاد علی چاند پوریؒ ہیں، جو چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۰۴ھ/ 1887 میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ وعظ و تقریر میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مناظرے میں تو اُن کا پایہ بہت ہی بلند تھا۔ اس فن پر اُن کی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ عرصۂ دراز تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور مراد آباد وغیرہ کے مدارس میں مدرّس رہے۔ سیّد سلیمان ندوی اسی زمانے میں اس مدرسے میں ان کے شاگرد رہے۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند میں ناظمِ تعلیم اور شعبۂ تبلیغ کی نظامت کا کام کرتے رہے۔ آخر عمر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع کیا اور اُن کے مجازِ بیعت ہوئے۔ یکم/ رمضان ۱۳۵۰ھ/ 1931ء کو دارالعلوم سے سبکدوش ہوکر چاند پور چلے گئے اور وہیں ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ/ دسمبر 1951ء میں وفات پائی۔ ''تحریکِ ریشمی رومال ڈائریکٹری'' میں ان کا ذکر کرتے ہوئے تحریر ہے: ''یہ مولانا محمود حسن کا پکا معتقد اور سازشِ جہاد کا سربرآوردہ ممبر ہے۔ دیوبند کے خفیہ مشوروں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ...مولانا محمود حسن اسے ساری پارٹی میں سب سے زیادہ لائق اور چالاک سمجھتے تھے۔ مولانا کے تحت وہ سب سے بڑا افسر تھا۔ صوبہ جاتِ متحدہ کی سی آئی ڈی نے جب اسے گرفتار کیا تو وہ مراد آباد کے کسی مدرسے میں مدرّس تھا۔'' (شخصیت نمبر172، ص462)

6۔ مولوی ظہور صاحب: ان سے مراد مولوی ظہور محمد ساکن سہارن پور ہیں، جو مدرسہ اسلامیہ انبالہ میں مدرّس اور پھر عربی سکول رُڑکی میں ٹیچر رہے۔ ان کے متعلق تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق مقدمے کی ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں تحریر ہے: ''وہ مولانا محمود حسن کی جہادی سازش کا ایک نہایت پُر جوش رُکن تھا اور بلاناغہ دیوبند آکر خفیہ مشورے میں شریک ہوا کرتا تھا۔ مولانا محمود حسن کے سفرِ عرب کے لیے بجنور، نگینہ اور نواحی علاقے سے اس نے روپیہ جمع کیا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ محمد میاں کی عرب سے واپسی تک روپیہ جمع کرتا رہے۔ اس انتظام کے تحت ظہور محمد نے رُڑکی اور گرد و نواح کے دیہات سے جمع شدہ چندے کی رقم سے مولوی حمداللہ کی مدد کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہاں اس غرض سے سینکڑوں اشخاص کی ایک سوسائٹی قائم کرلی تھی۔ محمد میاں، مرتضیٰ حسن، مولوی سہول وغیرہ کو جب وہ عرب سے لوٹ رہے تھے تو وہ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے بمبئی گیا تھا۔ مولانا محمود حسن اسے ''چپ چپ آدمی'' کہا کرتے تھے اور اکثر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ: ''وہ بڑا گہرا آدمی ہے۔'' کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا بے دھڑک آدمی تھا۔''

(شخصیت نمبر 219، ص 85-484)

7۔ مولوی انیس: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''پسر مولوی ادریس احمد آف علی گڑھ کالج، جمعیۃ الانصار دیوبند کا اور بعد میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کا طالبِ علم رہا۔ 1912ء کی جنگِ بلقان میں ترکی کی مدد کے لیے اس نے بڑے جوش وخروش سے چندہ جمع کیا اور بڑے جوش و جذبے کے ساتھ یورپی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔ اس نے خود بھی یورپی کپڑا پہننا چھوڑ دیا اور گاؤں کا بنا ہوا موٹا کھدر پہننے لگا۔ دیوبند میں خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور مولوی عبیداللہ کا نہایت مخلص ساتھی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے روپیہ جمع کرنے میں اس نے محمد میاں کی بھی مدد کی ہے۔ اس کا باپ ادریس احمد نظارۃ المعارف کمیٹی کا ممبر تھا اور دلی کی مشہور وہابی فرم حاجی علی جان اینڈ کمپنی کے حاجی عبدالغفار کا دوست تھا۔ مولانا محمود الحسن میں جہاد کا خیال پیدا کرنے اور اس کو تقویت دینے کی ذمہ داری میں اس کا بھی حصہ ہے۔ شاید وہ سازشِ جہاد کا رُکن تھا۔ آج کل وہ علی گڑھ میں دینیات کا پروفیسر ہے۔'' (شخصیت نمبر 67، ص 15-414)

8۔ قاضی صاحب: ان سے مراد حضرت مولانا قاضی محی الدین احمد قاضی ریاست بھوپال ہیں۔ ان کے والدِ گرامی کا نام نواب شیر علی خاں تھا، جو بہادر شاہ ظفر کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ قاضی محی الدینؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علما میں سے تھے۔ 1857ء میں شاملی کے معرکے میں حضرت نانوتویؒ نے ان کے والدِ گرامی نواب شیر علی خاں کے ذریعے ہی بہادر شاہ ظفر کو جدوجہدِ آزادی کے حوالے سے اپنی تجاویز پہنچائی تھیں۔ قاضی صاحبؒ ۱۳۳۳ھ/ 1915ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رُکن منتخب ہوئے اور وفات تک مجلس شوریٰ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۳۴۷ھ/ 1928ء میں ہوا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، از سیّد محبوب رضوی، ج 2، ص 27، طبع: ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند، یو۔ پی، طبع اوّل 1978ء)

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''قاضی محی الدین احمد خاں قاضی ریاست بھوپال تھا۔ وہ مراد آباد (یو۔ پی) کے نواب شیر علی خاں کا لڑکا تھا۔ اس کو ''نواب محی الدین'' بھی کہا جاتا ہے۔ وہ مولانا محمود حسن کا دیوبند میں ہم سبق تھا۔ اس وقت ان کے درمیان بڑی گہری دوستی ہے۔ ایم محمود حسن کی باغیانہ سرگرمیوں سے اس کا بڑا گہرا تعلق تھا اور سازشِ جہاد کا رُکن تھا۔ جب مولانا مکہ روانہ ہوئے تو ان کو رخصت کرکے بمبئی گیا تھا۔'' (شخصیت نمبر 185، ص 468)

9۔ حکیم صاحب: ان سے مراد حکیم عبدالرزاق انصاریؒ ہیں، جو ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کے بھائی تھے۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جدہ کے بعد کے واقعات کے بیان میں جو خط عبیداللہ نے حضرت مولانا کو لکھا ہے، اس میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ حکیم عبدالرزاق انصاری ہے جو ڈاکٹر انصاری کا بھائی ہے۔'' (شخصیت نمبر 94، ص 427)

10۔ سیّد نور: ان سے مراد حضرت مولانا سیّد نورالحسن ہیں، جو مولانا سیّد ہادی حسن کے چچا تھے۔ یہ ٹھیڑی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''یہ سیّد ہادی حسن کا چچا ہے۔ یہ امیر آدمی ہے اور مولانا محمود حسن کا پکا مرید ہے۔ جب وہ دیوبند تھے تو یہ برابر آتا رہتا تھا۔ سازش کا ایک اہم ممبر ہے۔ محمود حسن کے مکان پر جو خفیہ مشورے ہوتے تھے، ان میں بڑا حصہ لیتا تھا۔ مولانا محمود حسن نے جب حجاز گئے تھے تو اپنی عدمِ موجودگی میں اسے ہندوستان میں اسلحہ اور ہتھیاروں کا نگراں بنایا تھا۔ مولانا کے ہمراہ بمبئی تک گیا تھا، جہاں وہ مولانا کے سفر کے تمام انتظامات کا ذمہ دار اور نگران تھا۔ مولانا محمود حسن نے انور پاشا، جمال پاشا اور غالب پاشا سے جو چھ فرمان حاصل کیے تھے اور سیّد ہادی حسن کی نگرانی میں جنھیں ہندوستان بھیجا تھا، وہ ڈاکٹر حاجی شاہ بخش (ولد امام بخش لاشاری سندھی) کے ذریعے ایس نورالحسن کو پہنچائے جانے تھے۔ ایک شخص احمد مرزا کو ان کا فوٹو لینا تھا اور ان میں سے دو ایک خاص ایلچی کے ذریعے جس کا نام ہاشم تھا، کابل لے جائے جانے تھے۔ ہاشم اسی مقصد کے لیے عربستان سے آنے والا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے پشاور میں عبدالرحیم (شاید آزاد علاقے کے ایم بشیر) کو دو سو روپے بھیجے تھے۔'' (شخصیت نمبر 197، ص 474)

11۔ مولوی رام پوری: ان سے مراد مولانا احمد رام پوریؒ ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اطلاع

www.rahimia.org

دی ہے کہ تحریکِ ریشمی رومال سے متعلق مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں یہ شریک تھے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں: ''شوال ۱۳۳۳ھ (اگست 1915ء) میں جب کہ حضرت (مولانا خلیل احمد) سہارن پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز کی روانگی تجویز ہو رہی تھی اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی غیبت (غیر موجودگی) میں اس تحریک کی قیادت اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ کے سپرد ہوئی تھی، وہ مظاہر العلوم ہی میں طے ہوئی تھی۔ اور اس سے ان حضرات کے آپس کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شوال ۱۳۳۳ھ کے پہلے ہفتے (12/تا19/اگست 1915ء) میں حضرت شیخ الہندؒ دیو بند سے اور اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ رائے پور سے اور مولانا احمد صاحب رام پوریؒ رام پور سے سہارن پور تشریف لائے اور چار پانچ روز تک مدرسے کے کتب خانے میں یہ سب تجاویز طے ہوئی تھیں۔'' (''آپ بیتی''، از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، ج:04۔ ص:27۔ طبع: سہارنپور) ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جدہ کے بعد کے واقعات کے بیان میں حضرت مولانا کے نام عبیداللہ نے اپنے خط میں تذکرہ کیا ہے۔ رام پور کے مولوی احمد یہی ہیں، حکیم ہیں۔ یہ مولانا محمود حسن کے شاگرد اور مدرسہ دیو بند کی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا محمود حسن کے سفرِ حج پر ان سے ملنے دیو بند آئے اور سفرِ حج کے لیے تین سو روپے دیے، لیکن مولانا نے ان سے کہا کہ روپیہ اپنے پاس رکھیں اور جب ضرورت ہو تو حمد اللہ کو دے دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس تحریک سے الگ ہو گیا اور روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔'' (شخصیت نمبر 189، ص70-469) ان کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

12۔ حکیم مسعود: ان سے مراد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد گنگوہیؒ ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۴/ جمادی الثانیہ ۱۲۷۸ھ/ 27/دسمبر 1861ء بروز جمعہ کو ہوئی۔ مولانا بہترین حافظ، قاری اور عالم اور حکیم تھے۔ حکمت اور طبابت میں ماہرِ کامل اور بہت اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ آپ اپنے علم و عمل، تقویٰ و طہارت کے ساتھ ایک بہت ہی بارُعب اور ذی وجاہت شخص تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے تمام خلفا آپؒ کا بہت ہی زیادہ احترام کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد آپؒ دارالعلوم دیو بند کی شوریٰ کے رُکن رہے اور دارالعلوم میں جب بھی کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ کی بات فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی۔ اپنے والدِ گرامی حضرت گنگوہیؒ کے ساتھ شکل وصورت اور شباہت میں بہت مماثلت رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۵۰ھ/ 1932ء میں گنگوہ میں ہوا۔ (تذکرہ اکابرِ گنگوہ، از مفتی خالد سیف اللہ، ص 277، طبع: گنگوہ، ضلع سہارن پور)

13۔ مہتممین: ان سے مراد حضرت مولانا حافظ محمد احمد (۱۲۷۹ھ/ 1862ء - ۱۳۴۷ھ/ 1928ء) مہتمم دارالعلوم دیو بند اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (وفات ۴/رجب ۱۳۴۸ھ/ 1929ء) نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند ہیں۔

14۔ رائے پور: اس سے مراد خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور ہے۔ یہاں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے پاس ''غالب نامہ'' کی نقل حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ نے پہنچائی تھی۔ ایک خط میں ''رائے والا مولوی'' کا تذکرہ بھی آیا ہے۔

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے بانی ہیں۔ آپؒ نے اس سلسلۂ عالیہ کا آغاز اپنے پیر و مرشد کے حکم پر ۱۳۰۰ھ/ 1882ء میں قصبہ رائے پور ضلع سہارن پور سے کیا۔ اسی لیے یہ ''سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور'' کے نام سے مشہور ہوا۔ آپؒ کی پیدائش ۱۲۷۰ھ/ 1853ء میں موضع تگری ضلع انبالہ میں ہوئی۔ آپؒ کے والدِ گرامی حضرت راؤ اشرف علی صاحبؒ تھے، جو کہ سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرید تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے آپؒ کا نام ''عبدالرحیم'' رکھا۔ آپؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں لدھیانہ میں حضرت مولانا محمد لدھیانویؒ وغیرہ سے پڑھیں۔ آپؒ نے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ سے دورۂ حدیث شریف پڑھ کر دینی علوم کی تکمیل ۱۲۹۱ھ/ 1874ء میں کی۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی آپؒ نے ۱۲۸۸ھ/ 1871ء میں حضرت اقدس میاں شاہ عبدالرحیم سرساوی سہارن پوری سے بیعت کی اور سلوک و احسان کی تعلیم و تربیت مکمل کی۔ آپؒ ایک طرف

سیدو شریف کے مشہور بزرگ حضرت اخوند عبدالغفور سواتی عرف ''سیدو بابا'' کے جانشین حضرت میاں عبدالرحیم سہارن پوریؒ کے خلیفہ اور جانشین ہیں تو دوسری طرف اپنے دور میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سلسلے کے عظیم وارث سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ اور ان کے جانشین امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے خلیفہ اور جانشین ہیں۔ اور اسی طرح حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے فیضِ روحانی سے بھی آپؒ پوری طرح سیراب ہوئے۔ اور ان حضرات کے بعد ان کے جانشین اور قائم مقام ہوئے۔ بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ؎

جنھوں نے ''رائے پور'' میں بیٹھ کر ''گنگوہ'' دیکھا ہے
انھیں ہی یاد کچھ ''گنگوہ'' کا جغرافیہ ہوگا

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں حضرت اقدس عالی رائے پوریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''حضرت مولانا (محمود حسن) کے نام عبیداللہ کے خط میں اس کا تذکرہ ہے۔ یہ غالباً رائے پور ضلع سہارن پور کے مولوی عبدالرحیم ہیں، جو مولانا رائے پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ مولانا محمود حسن کی جہاد کی سکیموں میں شریک تھے، لیکن (ان کی) ہندوستان سے ہجرت کے مخالف تھے۔ یہ دیوبند کے مدرسے کی کمیٹی میں بھی شامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن عدم موجودگی میں اسے نائب نمائندہ کے طور پر روپیہ جمع کرنا اور اُسے (مولانا) حمداللہ (پانی پتی) کو پہنچانا تھا۔'' (شخصیت نمبر 188، ص ڈائریکٹری 92، ص کتاب 469) حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ''نقش حیات'' میں لکھتے ہیں: ''جب اعلان جنگ کے بعد حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کردی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ صاحب انجام دیتے رہیں گے۔ چناں چہ اسی طرح عمل درآمد رہا کیا، حضرت رائے پوریؒ نہایت دل سوزی اور استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی راز داری کے ساتھ امورِ مہمہ کو انجام دیتے رہے اور ان کے خاص خدام بھی دلچسپی لیتے رہے۔'' (نقش حیات از حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، ج:2، ص:204، مطبوعہ: عزیز پبلی کیشنز، لاہور)

حضرت اقدس عالی رائے پوریؒ جہاں تزکیۂ قلوب اور تصفیہ باطن کے حوالے سے مرشدِ برحق اور قطبِ عالم تھے، وہاں برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی مشہور تحریک ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے سرپرست اور مجاہدِ حریت بھی تھے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کی تعلیمات پھیلانے کے لیے آپؒ نے بستی بستی گاؤں گاؤں ''مکاتبِ قرآنیہ'' قائم فرمائے۔ نیز آپؒ بہت سے مدارسِ دینیہ کے سرپرست رہے۔ اس طرح آپؒ شریعت، طریقت اور سیاست کے جامع فرد تھے۔ آپؒ کی ذات قدسی صفات کی صحبت سے ہزاروں سالکین و طالبین سیراب ہوئے اور خداپرستی اور انسان دوستی کا نظریۂ فکر و عمل چہار دانگ عالم میں پھیلا۔ آپؒ کا انتقال ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ/ 29 جنوری 1919ء کو ہوا اور گلزارِ رحیمی در خانقاہِ رائے پور میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ (سوانح حیات قطبِ عالم شاہ عبدالرحیم رائے پوری، از مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، طبع رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

15۔ مولانا حمداللہ صاحب (پانی پتی): ان کے والد گرامی کا نام شیخ سراج الدین تھا۔ ان کا آبائی وطن پانی پت ضلع کرنال تھا۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے یہ نام آیا ہے۔ ولد سراج دین، ذات شیخ آف پانی پت، ضلع کرنال۔ ابتدائی تعلیم پانی پت و کانپور میں حاصل کی۔ بعد میں دیوبند کے مدرسے میں شامل ہوا، جہاں وہ تقریباً تین برس تک رہا۔ تکمیل تعلیم کے بعد کرنال، چھتاری ریاست وغیرہ مقامات میں 1912ء تک رہا۔ اس کے بعد ترجمہ قرآن میں مولانا محمود حسن کی مدد کرنے کے لیے دیوبند کے مدرسے میں پھر شامل ہوگیا۔ وہ مولانا کا پکا مرید بن گیا اور عبیداللہ ایم ابواحمد، ایم احمد علی وغیرہ کا شریک ہوگیا۔ جن کے بارے میں اب معلوم ہوا ہے کہ وہ اتحادِ اسلامی کے لیے جہاد کے بڑے اہم مبلغ ہیں۔ جنگِ بلقان کے دوران ترکی کی مدد کے لیے ایک ہزار روپے جمع کیے۔ دیوبند کی خفیہ میٹنگوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ بعد میں وہ خورجہ کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں معلم کے طور پر مقرر ہوگیا۔ اس ذریعے سے وہ دیوبند کے اسفار کے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اس کا

ارادہ مولانا محمود حسن کے ہمراہ عرب جانے کا تھا، لیکن انھوں نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا، تا کہ وہ مولانا محمود حسن کے ہمراہ حجاز جانے والے سازشی ساتھیوں کے کنبوں کی دیکھ بھال کرے اور سرحد پار کی پارٹی کو روپیہ بھیجے۔ نیز ہندوستان میں کام کی پیش رفت سے مولانا کو باخبر رکھے، نیز مولانا اور سرحد پار کے لوگوں کے درمیان خط و کتابت کے رابطے کا کام دے۔ اس ساری مدت میں اس نے مولانا کی بڑے وفادار ساتھی کی طرح خدمت کی ہے اور اس کو خاص آدمی کہا جاتا ہے۔ نومبر 1915ء میں یار محمد کابلی کے ذریعے اس نے دوسو تیس روپے مجاہدین کے ایک ایلچی کے ذریعے روانہ کیے۔ کابل سے ایم عبداللہ سندھی جو خطوط لایا تھا، ان میں سے ایک خط اور جہاد کے لیے دو فتاویٰ ایم حمداللہ کے واسطے تھے۔ بلاشبہ محمود الحسن نے جب وہ ہندوستان میں تھے، اس کو چندہ جمع کرنے کے لیے ملازم رکھا تھا۔ ایم حمداللہ اس وقت موگا ضلع فیروز پور میں ہے اور اس کی نقل و حرکت پر پابندی ہے۔'' (شخصیت نمبر 95، ص28-427)

16۔ مولانا مبین صاحب: مولانا محمد مبین خطیب دیوبند کے رہنے والے تھے۔ ان کے والدِ گرامی حاجی محمد مؤمن دیوبندی تھے۔ انھوں نے مدرسہ مظاہر العلوم میں حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ سے تعلیم حاصل کی اور ۱۳۲۵ھ/ 1907ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کر کے سند حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ معین الاسلام انبالہ چھاؤنی مشرقی پنجاب میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اُس کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہیں۔ (ذکرِ متین بمع تذکرۂ مبین، از حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ص11، طبع لاہور و تاریخ مظاہر العلوم، از حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، جلد اوّل)

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''اگر چہ وہ مولوی خلیل احمد کا مرید ہے، لیکن مولانا محمود حسن کے عرب جانے سے چھ ماہ پہلے ان کا سخت معتقد ہو گیا۔ اس کی سازش کا ایک رُکن بن گیا۔ دیوبند کی خفیہ میٹنگوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس نے مولانا محمود حسن کے سفرِ حجاز کے لیے میرٹھ، دلی، راندیر، کلکتہ، رنگون وغیرہ سے رقوم جمع کیں۔ محمود حسن کی روانگی کے وقت ستمبر 1915ء میں محمد مبین کو کلکتہ روانہ کیا گیا، تا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا کی ہجرت کا سبب بتا سکے۔ اور وہاں سے ان کا جواب مولانا کو بمبئی پہنچائے۔ محمد میاں عرف مولوی منصور نے غالب نامہ لے کر کابل روانہ ہونے سے پہلے اس سے انبالہ میں ملاقات کی۔ (نوٹ) محمد مبین خطیب کے نام سے بھی مشہور ہے، جس کا مطلب ہے کہ نمازِ عیدین کے خطبہ پڑھنے والا حضرت مولانا کے نام عبیداللہ کے خط میں خطیب کا جو لفظ آیا ہے، شاید اس کا اشارہ اسی کی طرف ہو۔'' (شخصیت نمبر 162، ص57-456)

1947ء کے بعد مولانا محمد مبین پاکستان تشریف لے آئے۔ ان کا انتقال 14/ جولائی 1969ء کو کراچی میں ہوا اور دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ (ذکرِ متین)

17۔ مولانا احمد ابومحمد (چکوالی) صاحب: مولانا ابومحمد احمد چکوال کے رہنے والے تھے۔ ان کے والدِ گرامی کا نام غلام حسن اعوان تھا۔ انھوں نے گنگوہ اور دیوبند 1891ء میں درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''کنیت مولوی احمد چکوالی، پسر غلام حسن، ذات اعوان، ساکن چکوال ضلع جہلم۔ گنگوہ اور دیوبند میں تعلیم پائی ہے۔ دیوبند میں مولانا محمود حسن اس کے استاد تھے۔ اس جگہ اس کی عبیداللہ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اس وقت طالبِ علم تھا۔ وہ محمود حسن کا پُرخلوص مرید بن گیا۔ 1892ء میں صوفی مسجد کشمیری بازار لاہور کا امام مقرر کیا گیا۔ ستمبر 1916ء میں اپنی گرفتاری تک مامور رہا۔ کچھ عرصے تک دیوبند میں جمعیت الانصار کا نائب ناظم رہا۔ مولوی احمد ہندوستان میں وہابی تحریک کا نہایت اہم رُکن ہے۔ عبیداللہ کا نہایت مخلص اور پُر جوش ساتھی ہے۔ ہندوستانی متعصّبوں سے اس کا قریبی رابطہ تھا۔ کئی مرتبہ (مجاہدین کے مرکز) اسمس جا چکا ہے۔ چندہ جمع کرنے کے لیے پنجاب میں مجاہدین کا خاص ایجنٹ ہے۔ آزاد علاقے میں ہندوستانی انقلاب پسندوں کو سرمایہ مہیا کرنے کے کام میں مولوی حمداللہ (پانی پتی) کا خاص معاون ہے۔ اساس کے ہندوستانی متعصّبوں اور ہندوستان میں ان کے ہمدردوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ صوفی مسجد سرحد کو جانے اور واپس آنے والے نمائندوں کے

www.rahimia.org

ٹھہرنے کے کام آتی ہے۔ قاضی ضیاء الدین ایم۔اے کا چچا اور دلی کے (مولانا) احمد علی (لاہوری) کا خسر ہے۔ جہادی طلبا کے فرار سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ شیخ عبدالرحیم کے نام وضاحتی خط میں جواب کے لیے اُس کو ذریعہ بنانے کا تذکرہ ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔ آج کل روپڑ ضلع انبالہ میں ہے، جہاں اُس کی نقل و حرکت پر پابندی ہے۔'' (شخصیت نمبر 6، ص 89-388)

18۔ خواجہ عبدالحیؒ صاحب: ان کے والدِ گرامی کا نام خواجہ عبدالرحیم تھا۔ یہ ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کابل گریجویٹ تھے۔ ۱۳۲۹ھ/ 1911ء میں دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث پڑھ کر درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے پڑھتے رہے۔ ۱۳۳۶ھ/ 1917ء میں انھیں لاہور میں نظر بند کر دیا گیا۔ دو سال بعد رہائی ملی۔ رہائی کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں تفسیر کے استاد اور شعبۂ دینیات کے ناظم رہے۔ انھوں نے کئی سورتوں کی تفسیر ''تفسیر الفرقان فی معارف القرآن'' کے نام سے تفسیر لکھی۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور میں علما کا ایک بورڈ بنا کر ''درسِ قرآن'' کے نام سے سات جلدوں میں تفسیر لکھی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص 110) ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''پسر عبدالرحیم جو خورشید عالم بیرسٹر ایٹ لاء گورداس پور کا منشی ہے۔ اُس نے گورداس پور، لاہور اور دیوبند کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے۔ آخر الذکر مقام میں وہ عبیداللہ کا بہت مخلص ساتھی تھا۔ وہ اسلامیہ کالج میرٹھ اور صوبہ جات متحدہ کے کئی اسلامی اداروں میں اور گوجرانوالا کے اسلامیہ ہائی سکول میں ملازم رہ چکا ہے۔ اگست 1915ء میں اس نے گورداس پور میں تقریر کر کے لوگوں کو جہاد پر اُبھارا تھا۔ کچھ عرصے تک وہ ''اقدامِ کلکتہ'' کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل رہا ہے۔ وہ نجم الدین احمد، ابوالکلام آزاد اور محی الدین عرف برکت علی قصوری کا ساتھی رہا ہے۔ یہ سب کے سب انتہائی درجے میں اتحادِ اسلامی کے حامی ہیں۔ دیوبند میں مولانا محمود حسن کے مکان میں خفیہ میٹنگوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔'' (شخصیت نمبر 28، ص 398) خواجہ صاحبؒ فالج کے حملے کے باعث 8 / جنوری 1965ء کو تقریباً 78 سال کی عمر میں وصال فرما گئے۔ قبرستان میانی صاحب لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے قریب ہی مدفون ہیں۔

19۔ حاجی صاحب (ترنگ زئی): ان کا اصل نام سیّد فضلِ واحد تھا اور ان کے والدِ گرامی کا نام فضلِ احد تھا۔ وہ 1858ء میں ترنگ زئی میں پیدا ہوئے۔ سادات کا یہ گھرانہ عوام میں بہت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ حاجی صاحبؒ کی والدہ ماجدہ حضرت کاکا صاحبؒ کے گھرانے کی ایک عابدہ زاہدہ خاتون تھیں۔ انھوں نے ترنگ زئی کے بڑے استاذ سیّد ابوبکر سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر مزید تعلیم کے لیے پشاور میں ''تہکال پایان'' کے مشہور دینی دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے کے مہتمم براہِ راست تحریکِ ولی اللّٰہی سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے اور طلبا کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور فکری تربیت بھی کرتے تھے۔ اور وہ مشہور سرحدی مجاہد حضرت نجم الدین ہڈے مُلّا سے بیعت بھی تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے گاؤں ترنگ زئی واپس آگئے اور زمین داری کرنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے حضرت نجم الدین ہڈے مُلّا خلیفہ حضرت اخوند عبدالغفور سواتیؒ ''سیدو بابا'' کے ہاتھ پر طریقۂ قادریہ میں بیعت کی اور اُن سے طریقت کی تکمیل کی۔ اسی کے ساتھ اپنی خاندانی روایات کے مطابق انھوں نے تبلیغ و ارشاد کو بھی اپنا شعار بنایا۔ اسی اثنا میں وہ دارالعلوم دیوبند گئے اور انھیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے تعارف حاصل ہوا اور وہ شیخ الہندؒ کے انقلابی نظریات سے بہت متأثر ہوئے۔ ان کے حضرت شیخ الہندؒ سے بڑے گہرے تعلقات ہوگئے۔ چناں چہ جب ترکی اور روس کی جنگ (77-1876ء) میں ترکی کی طرف سے جہاد میں شرکت اور حج کی ادائیگی کے لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے سفرِ حجاز اختیار کیا تھا تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ہمراہ حاجی صاحب ترنگ زئی بھی ۱۲۹۴ھ (دسمبر 1877ء) میں شریکِ سفر تھے اور مکہ معظّمہ میں انھیں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعتِ جہاد کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

حاجی صاحب ترنگ زئی نے 1897ء میں اپنے شیخ حضرت ہڈے مُلّا کی قیادت میں مالاکنڈ، چکدرہ میں انگریز چھاؤنیوں کے خلاف جہاد میں عملی حصہ لیا۔ مالاکنڈ، بٹ خیلہ، پیر کلے کے محاذوں پر انھوں نے دشمن سے خوب ٹکر لی۔ 1908ء میں انھوں نے دوبارہ حجِ

بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ واپس آ کر انھوں نے پورے علاقے میں غلط رسومات اور فضول کاموں سے بچانے کے لیے عوام میں بڑا کام کیا۔ دیہاتی آبادی کی اکثریت ہندو مہاجنوں کی مقروض تھی۔ حاجی صاحبؒ نے لوگوں کو فضول خرچی اور مقدمے بازی کے جھگڑوں سے بچنے اور سادگی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اس طرح عوام میں ذہنی بیداری پیدا کر کے ایک انقلاب پیدا کیا۔ اسی طرح انھوں نے فرنگیوں کے غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے والے نظامِ تعلیم کے مقابلے پر پچاس کے قریب آزاد قومی مدرسے اور سکول قائم کیے، جب کہ گدر ضلع مردان میں ایک مرکزی آزاد دارالعلوم قائم کیا گیا۔ ان خدمات کی پاداش میں انگریز نے انھیں گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ جب ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملا تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے 21/ مارچ 1912ء کو اسلامیہ کالج پشاور کا سنگِ بنیاد بھی رکھا۔ 1912ء ہی میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ نے جمعیت حزب اللہ قائم کی تو قبائلی علاقوں میں اس کے لیے 1914ء میں دہلی کی فتح پوری مسجد میں منعقد ہونے والے ایک خفیہ اجلاس کے فیصلے کے مطابق عملی جہاد کے شعبے کے لیے حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کو امیر المجاہدین مقرر کیا گیا۔ چناں چہ 12/ جون 1915ء کو حاجی صاحب ترنگ زئی پشاور آئے اور اگلے ہی روز طے شدہ فیصلے کے مطابق آزاد علاقے میں جا کر انگریز سامراج کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔ (تذکرہ سرفروشانِ صوبہ سرحد)

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''وہ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔ ...مرحوم مُلّا ہڈا کے پیروؤں میں اور پشاور ضلع کے اکثر دیہات میں نہایت بااثر ہے۔ نہایت متعصب ہے اور حکومت کے خلاف سخت مخالفانہ جذبات رکھتا ہے۔ 1915ء میں دیوبند کے مولانا محمود حسن کے ایما پر آزاد علاقے میں چلا گیا تھا، جہاں سیف الرحمٰن اس سے جا ملا تھا۔ اس کے بعد سے مہمند، بونروال اور دوسرے قبیلوں کو علمِ جہاد بلند کرنے پر اُکسانے میں نہایت سرگرم رہتا ہے۔ شب قدر کے حملے کے لیے خاص طور سے ذمہ دار ہے۔ کابل کے سازشیوں سے رابطہ ہے اور پانی پت کے ایم حمد اللہ اور صوفی مسجد لاہور کے مولوی احمد کے ذریعے دیوبند پارٹی سے امداد حاصل کی ہے۔'' (شخصیت نمبر92، ص 426) اس کے بعد بھی 1935ء تک حضرت حاجی صاحبؒ آزاد علاقوں میں رہ کر انگریز سامراج کے خلاف جہادِ آزادی میں مصروف رہے۔ 1936ء میں وہ بیمار پڑ گئے۔ بالآخر 14/ دسمبر 1937ء میں اکیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ (تذکرہ سرفروشان صوبہ سرحد، ص 221 تا 235)

20۔ مولوی فضل محمود مہاجر: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''شاید ضلع پشاور کا رہنے والا ہے۔ مولانا محمود حسن کا مرید ہے۔ اس کو سیف الرحمٰن اور فضل ربی کے ساتھ سرحد پار بھیجا گیا، تاکہ قبائلیوں کو برطانیہ کے خلاف جنگ کے لیے بھڑکا سکیں۔ 1915ء میں قبائلیوں کی شورش کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ جون 1916ء کے لگ بھگ مولانا فضل ربی (انجمن حزب اللہ کے یاغستان میں وکیل) اور عبدالعزیز کے ہمراہ حاجی ترنگ زئی کی طرف خفیہ مشن پر کابل گیا کہ سردار نصراللہ خاں سے ملاقات کرے۔ مشن کے دوسرے ممبروں کی واپسی کے بعد بھی کابل میں ٹھہرا رہا۔ جولائی 1916ء میں انقلابیوں کی پارٹی کے ساتھ آزاد علاقے کو واپس آیا، جو ملاؤں اور خانوں کے لیے سردار نصراللہ خاں کے خطوط ساتھ لائی تھی۔ وہ حاجی صاحب ترنگ کے لیے خط لایا تھا۔ شاید ابھی تک آزاد علاقے میں ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ (شخصیت نمبر78، ص240)

21۔ مولوی عبدالعزیز: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''پسر حمداللہ، ساکن رحیم آباد، زند در بھنگہ، بہار و اڑیسہ۔ مشہور وہابی مولوی ہے، جو شمالی ہند میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں اس کا نام لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے شامل ہے۔'' (شخصیت نمبر24، ص396)

22۔ مولوی تاج محمد صاحب بی۔ اے: ان سے مراد امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مرشدِ ثانی حضرت مولانا سیّد تاج محمود امروٹیؒ ہیں۔ وہ خیر پور میرس کے قریب ''گوٹھ دیوانی'' میں وقت کے معروف عالم دین سیّد عبدالقادر شاہؒ المعروف ''بھورل شاہ'' کے ہاں 1858ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی اور پھر عصری علوم کی تحصیل بھی کی۔ اس کے بعد سیّد العارفین

حافظ محمد صدیق بھرچونڈویؒ کی خدمت میں پہنچے اور اُن کے اجل خلفا میں سے تھے۔ یہ ہجرت کر کے یاغستان تشریف لے گئے تھے، اسی کا اس خط میں تذکرہ ہے۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''شاید یہی مولوی تاج محمد ساکن امروٹ سکھر سندھ ہیں۔ سندھ میں دوسرے نمبر پر اس کا زبردست اثر ہے، جو صرف مولوی ہمایوں کے اثر سے کم ہے۔ وہ کھڈہ کراچی کے مولوی محمد صادق کا دوست ہے، جو اَب کارواڑ (مہاراشٹر) میں نظربند ہے۔ خیال ہے کہ اس نے مولوی عبیداللہ کے فرار افغانستان میں اس کی مدد کی تھی۔ اس کے ہزاروں پیرو ہیں، جن میں بڑے بڑے زمین دار، پلیڈر اور سرکاری ملازمین شامل ہیں۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔'' (شخصیت نمبر 212، ص 481) انگریزوں نے کسی شقی القلب کے ہاتھوں مولاؒنا کو زہر دے دیا تھا، جس کے اثر سے ان کے جسم پر تکلیف دہ پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ اسی زہر کے اثر سے یہ حریتِ وطن کے عظیم رہنما اور حضرت شیخ الہندؒ کے قریبی ساتھی 5/نومبر 1929ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

23۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب: ان کے والدِ گرامی کا نام غلام خان تھا، جو متھرا، تھانہ شنکر گڑھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ (خیبر پختونخواہ) کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق درانی خاندان سے ہے۔ یہ خاندان کابل سے ترکِ وطن کر کے پشاور میں سکونت پذیر ہو گیا۔ انھوں نے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے علومِ ریاضی کی تکمیل کی۔ پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر علومِ حدیث کی تکمیل کی۔ اس کے بعد شاہ جہان پور کے اسلامیہ سکول میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پھر ایک مدت تک ریاست ٹونک کے ایک ریاستی سکول میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر مدرسۂ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرّس ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ اور اُن کی تحریک کے سرگرم رُکن رہے۔ بڑے عالی ہمت، ذہین، ذکی اور مجاہد عالم تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد فرمانے پر جون 1915ء میں ہجرت کر کے یاغستان کے آزاد علاقے میں چلے گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے سے ہندوستان کی آزادی کے لیے تیار کرتے رہے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی مرتب کردہ ''جنودِ ربانیہ'' کی فہرست میں ان کا عہدہ میجر جنرل کا تھا۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جون 1915ء تک یہ دہلی میں رہا، جب کہ مولانا محمود حسن، عبیداللہ اور ابوالکلام آزاد کی سکیموں کے تحت سرحد پار کر گیا۔ وہ حاجی صاحب ترنگ زئی پر اثر ڈال کر اُن سے غلط اقدامات کراتا رہا، جن کا وہ خود ہی سیکرٹری بن گیا تھا۔ سیف الرحمٰن کے اثر سے حاجی صاحب ہمیشہ آزاد قبائل اور مجاہدین میں تعصب کا جوش پیدا کرنے میں سرگرمی میں مصروف رہتا تھا۔ 1915ء میں سرحد پر جولڑائیاں ہوئیں، ان کی ذمہ داری بڑی حد تک اس پر ہے۔'' (شخصیت نمبر 196، ص 473) تحریکِ ریشمی رومال کے بعد افغانستان چلے گئے اور وہاں امیر امان اللہ خان کے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پشاور واپس آ گئے۔ 7/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۷۹ھ/ 25/فروری 1950ء کو اپنے آبائی وطن پشاور میں وفات پائی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص 71-69)

ان کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں: ''مولانا سیف الرحمٰن کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات میں علاحدگی کا وعدہ کرا لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک (وزیرِ مالیات مرزا محمد حسین) کے مہمان ہو کر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت کے آخر تک وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لیے دیا جاتا، اس میں اس کی امداد کرتے۔'' (کابل میں سات سال، از مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مرتبہ: محمد سرور، ص 90، طبع: سندھ ساگر اکادمی، لاہور)

24۔ امیر المؤمنین خلیفۂ رسول ربّ العالمین: ان سے مراد سلطان محمد خامس ہیں، جو سلطان عبدالحمید کی 1909ء میں تختِ خلافت سے معزولی کے بعد خلیفۂ عثمانی کے منصب پر فائز ہوئے۔ انھوں نے اپریل 1909ء سے 1917ء تک تقریباً 8 سال حکومت کی۔

25۔ مولوی عبدالرحیم لاہوری معروف بہ بشیر: یہ مولانا رحیم بخش امام چینیاں والی مسجد لاہور کے صاحبزادے ہیں، جو جہادِ آزادی کے لیے آزاد علاقے میں مجاہدین کے مرکز ستھانہ میں پہنچ گئے تھے۔ کچھ عرصہ عسکری تربیت حاصل کر کے اس مرکز کے امیر بن گئے تھے۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''وہ انتہائی متعصب اور پُرجوش، جہاد تحریک کا بڑا سرگرم ممبر ہے۔

www.rahimia.org

لاہور کے جہادی طلبا کے سرحد کو فرار کے لیے خاص ذمہ داری اسی کی ہے۔ ان طلبا کے مفقود الخبر ہونے کے بعد خود بھی اچانک بڑی تیزی کے ساتھ آزاد علاقے کو غائب ہوگیا۔ ہندوستانی متعصبوں میں اس کا بہت کافی اثر ہے۔ مجاہدین کی حال ہی میں چمرقند میں جو آبادی قائم ہوئی ہے، عبدالکریم کی غیر حاضری میں اس کے گورنر کے فرائض انجام دیتا ہے۔ کابل میں خاص سازشیوں سے اس کا رابطہ ہے۔ رئیس المجاہدین اور سردار نصر اللہ خاں کے ایلچی کا کام کرتا ہے۔ کئی مرتبہ کابل جا چکا ہے۔ 1915ء کی سرحدی جنگ میں حصہ لے چکا ہے۔ درحقیقت اسی شخص نے بُنیر، صوات (سوات) کے قبائل کو اور مہمندوں کو برطانوی سرحد پر حملے کے لیے اُکسایا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ سردار نصر اللہ خاں سے روپیہ اور گولی بارود لایا تھا۔ اب سرحد پار کے علاقے میں قبائلیوں کو جہاد پر اُکسانے میں سرگرمی سے مصروف ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے۔'' (شخصیت نمبر 55، ص 409) انگریز ان کی سرگرمیوں سے بے حد خائف تھے۔ انھوں نے بہت سے مخبر ان کے پیچھے لگا رکھے تھے۔ بالآخر ایک مخبر نے یکم رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ (8/ دسمبر 1934ء) کو اس وقت شہید کر دیا، جب وہ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ (تذکرہ سرفروشانِ صوبہ سرحد، ص 263)

26۔ مسٹر محمد ابراہیم صاحب ایم۔ اے کرانچوی: ان سے مراد مولانا محمد صادق کھڈہ والوں کے بھائی محمد عبداللہ کے بیٹے شیخ محمد ابراہیم ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''شیخ محمد ابراہیم نے اقتصادیات میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کابل آنے سے پہلے میں نے سیاسی اشتراک ان سے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے پہلے کابل پہنچ کر حبیبیہ سکول (کابل) میں ملازم ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں فقط وہ میرے مشیر تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے پندرہ دنوں میں سات آٹھ صفحے لکھے اور شیخ محمد ابراہیم کو سنائے۔ انھوں نے بعض مفید اضافے کیے اور ہم نے یہ مضمون سردار (محمود) طرزی اور معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) کی معرفت سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں) کے پاس بھیج دیا۔'' (کابل میں سات سال، ص 40-39) ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''محمد صادق کا بھتیجا جو کھڈہ کراچی کا مشہور متعصب مولوی (اب نظر بند ہے) اور عبیداللہ کا دوست ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے نے پونہ میں تعلیم پائی ہے۔ فروری 1915ء میں اسے حبیبیہ کالج کابل میں پروفیسر کی جگہ مل گئی، جہاں وہ برطانیہ کا کٹر مخالف بن گیا۔ وہ کابل کا ایک بڑا انقلابی ہے۔ ایم عبیداللہ، محمد علی بی۔ اے قصوری، راجہ مہندر پرتاپ، برکت اللہ وغیرہ کے ساتھ سازشیں کرنے اور منصوبے بنانے میں اُس نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ ابراہیم اور محمد علی قصوری کو ایم عبیداللہ نے خاص طور پر سے کابل بلایا تھا کہ وہ وہاں جہاد کے لیے زمین ہموار کرسکیں۔ جون 1916ء میں اُسے محمد علی کے ساتھ حبیبیہ کالج سے برطرف کر دیا گیا۔ 10/ جولائی 1916ء کو آزاد علاقے کے لیے روانہ ہوگیا، جہاں وہ شاید اس وقت بھی سرحد پار کے ملاؤں، قبائلیوں وغیرہ کو جہاد پر اُکسانے میں مصروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 1916ء میں اُس نے براہِ عرب جرمنی جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے۔'' (شخصیت نمبر 2، ص 87-486)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ مزید لکھتے ہیں: ''حکومتِ ہند کے (افغان حکومت سے) پروٹیسٹ (احتجاج) کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی (قصوری) حبیبیہ اسکول سے معزول کر دیے گئے اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ سکول کا طالبِ علم تھا، خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد کے ہم جماعت قونصل، نائب وزیر اور جنرل بن گئے۔ اور یہ باوجود یہ کہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سب سے کسی طرح کم نہیں، اسی طرح جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔

شیخ محمد ابرہیم اور مولوی محمد علی (قصوری) نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں مجاہدین میں رہے۔ پھر شیخ محمد ابراہیم حاجی ترنگ زئی کے پاس چلے گئے اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی، لیکن راستے میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہوگئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے ان کے ساتھ تھا۔ اس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے اپنے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ اس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو، بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ

www.rahnuma.org

ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلابِ روس کے بعد شروع کیا تھا۔'' (کابل میں سات سال، ص 87-86)

27۔ حاجی عبدالرزاق خاں صاحب غازی: ان سے مراد سلطنتِ افغانستان کے قاضی عبدالرزاق ہیں۔ ان کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''سلطنتِ افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے، جسے ''میزان التّحقیقات الشّرعیہ'' کہتے ہیں۔ اس محکمے کے رئیس قاضی عبدالرزاق ہمارے دارالعلوم (دیوبند) کے تعلیم یافتہ ہیں۔ حدیث انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سے پڑھی تھی۔ وہ سردار نائب السلطنت (سردار نصراللہ خاں) سے خاص طور پر وابستہ تھے۔ جیسے سردار (محمود) طرزی معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خاں) سے اور سردار سپہ سالار (سردار محمد نادر خاں) اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خاں) سے۔ قاضی عبدالرزاق خاں سے ہم چند روز بعد ملے۔ ان سے باتیں کرکے پُرانے علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات وہاں ہمیں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص طور پر ان کے پاس اطلاعات تھیں۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ میرا ہی نام ''عبیداللہ'' ہے تو بہت مسرور ہوئے۔'' (کابل میں سات سال، ص 38) ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''ملّائے حضور، امیر کے دربار کا بڑا مُلّا۔ مدرسہ سلطانی یعنی کابل یونیورسٹی کا سربراہ، جس میں وہ فلکیات پر لیکچر دیتا ہے۔ دیوبند میں تعلیم پائی۔ مولوی احمد چکوالی کا ہم درس تھا۔ دلی کے مولوی سیف الرحمٰن کا مرید تھا۔ برطانیہ کے سخت خلاف ہے۔ کچھ عرصے تک سردار عنایت اللہ کا اتالیق رہا۔ دورۂ ہند میں ان کے ساتھ تھا۔ سردار نصراللہ خاں کا ناظر اور معتمدِ خاص ہے۔ سردار اسی کے ذریعے سرحد کے دوسرے ممتاز ملاؤں سے خط و کتابت کرتا ہے۔ تمام بڑے مُلّاؤں کا خاص دوست ہے۔ خصوصاً مُلّا قمرالدین کا، مُلّا پاوندہ (ان کا نام محی الدین تھا، وہ سلسلۂ عالیہ قادریہ کربوغہ شریف کے جانشین اور محسود اور وزیر قبائل کے رہنما تھے۔ انھوں نے انگریز سامراج کے خلاف محسود قبائل میں بڑی جنگیں لڑیں۔ تذکرہ سرفروشانِ صوبہ سرحد، ص 161) کا اور لالہ پیر کا۔ اطلاع ملی تھی کہ 1908ء میں 150 پیروؤں کے ہمراہ برطانیہ کے خلاف غزہ میں شامل ہونے کا روانہ ہوا تھا، لیکن امیر نے روک لیا۔ کابل میں ہندوستانی انقلابی پارٹی کا پشت پناہ ہے۔ سرحد پار جتنی بھی متعصّبانہ کارروائیاں ہوتی ہیں، اُن سب کی ڈور یہی شخص ہلاتا ہے۔ حالیہ قبائلی شورشوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ جب روسیوں نے عبدالباری اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کو گرفتار کیا تھا تو اُن کے پاس عبدالرزاق کے دستخطی پاسپورٹ تھے۔'' (شخصیت نمبر 51، ص 8-407)

28۔ مسٹر فان ہنتگ افسر جرمن: ان سے مراد کیپٹن مسٹر وون ہینٹنگ Von Henting ہیں، جو جرمنی کی طرف سے اس وفد میں شریک تھے اور دوسرے مسٹر نیڈن مائر ہیں، جو جرمنی کے سفیر متعین ایران تھے۔ اس وفد کے حوالے سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں: ''حربِ عمومی (جنگِ عظیم اوّل) کے شروع ہونے پر جس قدر آزادی خواہ ہندوستانی یورپ میں موجود تھے، وہ سب برلن (جرمنی) میں جمع ہوگئے تھے۔ اور انھوں نے جرمن دفترِ خارجہ کے ماتحت ایک ''انڈین نیشنل پارٹی'' قائم کی تھی۔ ہردیال (سنگھ) اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ اس میں شامل تھے۔ اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیرِ اہتمام راجہ مہندر پرتاپ اور ان کے رفقا کو، جن میں مولوی برکت اللہ صاحب بھی شامل تھے، جلد ہی ترک اور جرمن افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ مشن میرے کابل پہنچنے سے ایک ہفتہ پہلے (7/اکتوبر 1915ء کو) یہاں پہنچ چکا تھا اور ان کی مفصل ملاقاتیں (ارکانِ حکومت سے) ہوچکی تھیں۔'' (کابل میں سات سال، ص 42-41)

29۔ راجہ مہندر پرتاپ: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''حضرت مولانا کے نام عبیداللہ کے خط میں اور دوسرے خط میں جس میں ''حکومتِ مؤقتۂ ہند'' کی تفصیلات دی گئی ہیں، یہ نام لیا گیا ہے۔ ضلع علی گڑھ کے مقام مرسان کے راجہ دت پرشاد سنگھ بہادر کا بھائی اور جیند کے راجہ رنبیر سنگھ کا برادرِ نسبتی ہے۔ راجہ مہندر پرتاپ پُرانے حکمران خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ہاتھرس اور مرسان میں کافی اراضی کا مالک ہے۔ اس نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں تعلیم پائی، جہاں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ اس کے رگ و پے میں سرایت کرگیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے بندرابن میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں، نیز سکھوں پر مشتمل

www.rahimia.org

منتظمہ کمیٹی بنا کر پریم مہا ودیالیہ قائم کیا۔ راجہ کو اُمید تھی کہ اس اسکول کے ذریعے متحدہ ہندوستان کی اساس پر قومی اتحاد کی تحریک شروع کرے گا۔ وہ سفر کا بڑا شوقین تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دو بار ساری دنیا کا سفر کیا تھا۔ امریکا میں اس کی ملاقات ہردیال اور غدر پارٹی کے دوسرے ممبروں سے ہوئی اور اس میں انقلابی خیالات نے جوش وخروش پیدا کر دیا۔ 20/ دسمبر 1914ء کو ہندوستان سے مارسیلز روانہ ہوا، جہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ اور جرمنی پہنچ کر برلن کی انڈیا سوسائٹی میں شامل ہوگیا۔ 1915ء میں امیرِ کابل اور ہندوستانی والیانِ ریاست کے لیے قیصر اور سلطانِ ترُکی کے خطوط اور جہاد کے فتاویٰ دے کر اسے ترک جرمن مشن کے ہمراہ افغانستان بھیجا گیا۔

کابل کے قیام میں اس نے حکومتِ مؤقتۂ ہندیہ قائم کی، جس کا صدر وہ خود بنا۔ برکت اللہ وزیراعظم اور عبیداللہ وزیر داخلہ بنائے گئے۔ اس نے مہاجر طلبا کی بہت سی سفارتیں منظّم کیں، جو روس، چین، جاپان، برلن اور قسطنطنیہ بھیجی گئیں۔'' (شخصیت نمبر 125، ص 441)

30۔ جناب برکت اللہ صاحب بھوپالی: مولانا برکت اللہ بھوپالی کے والدِ گرامی مولوی شجاعت اللہ تھے۔ یہ نسلاً پٹھان تھے اور قبیلہ اچھو خانی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بدایوں سے بھوپال آگئے تھے۔ ان کی پیدائش بھوپال میں 1859ء میں ہوئی۔ انھوں نے بھوپال کے مدرسہ سلیمانیہ سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے وہاں بڑے جید اساتذہ سے تمام علوم حاصل کیے۔ پھر مسجد باجوڑیان محلّہ چھاؤنی میں مشہور عالم دین مولانا عبدالحق کابلی سے منطق اور تفسیر وغیرہ پڑھتے رہے۔ ان سے انھوں نے مشکوٰۃ، مؤطا اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا۔ وہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی تشریح وتوضیح میں بڑا خاص ملکہ رکھتے تھے۔

مولانا برکت اللہ صاحب 1878ء میں تمام دینی علوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے علما کے طریقۂ کار کے مطابق صرف خالص اللہ کے لیے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران ان کی مولانا جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی۔ بارہ سال تعلیم وتدریس کے بعد انگریزی زبان سیکھنا شروع کی۔ انگریزی کی ابتدائی تعلیم بھوپال ہی میں حاصل کی اور پھر ممبئی پہنچے۔ اور وہاں ولسن ہائی سکول کے ابتدائی درجے میں داخلہ لیا۔ ممبئی سے انھوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ لندن پہنچ کر انھوں نے شیخ الاسلام ڈبلیو ایچ عبداللہ کوئیلم کی معیت اختیار کی، جنھیں اسلام قبول کرنے کے بعد سلطان عبدالحمید نے جزائرِ برطانیہ کا شیخ الاسلام مقرر کیا تھا۔

جنگِ عظیم اوّل شروع ہونے پر مولانا برکت اللہ امریکا سے پہلے ترکی آئے۔ یہاں اکابرین سے صلاح مشورے کے بعد برلن کا رُخ کیا۔ وہاں اُن کی ملاقات راجہ مہندر پرتاپ سے ہوئی، جو کہ 10/فروری 1915ء کو برلن پہنچے تھے۔ وہاں سے جرمن ترک مشن کے لیے روانہ ہو کر 5/اپریل 1915ء کو ترکی پہنچے۔ وہاں سے انور پاشا اور شیخ الاسلام کے خطوط لے کر افغانستان کے لیے روانہ ہوئے۔ اور 21/اکتوبر 1915ء کو یہ مشن کابل پہنچا۔ پھر یکم/دسمبر 1915ء کو کابل میں ''حکومتِ مؤقتۂ ہند'' کا قیام عمل میں لایا گیا، جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''وہی بدنام مولوی برکت اللہ ہے، جو ٹوکیو میں اُردو کا سابق پروفیسر تھا۔ مخالف برطانیہ پروپیگنڈے کی وجہ سے جاپان میں مشہور ہوگیا۔ 1914ء میں حکومتِ جاپان کی طرف سے برطرف کیے جانے کے بعد سان فرانسسکو چلا گیا اور وہاں غدر پارٹی کا سرگرم ممبر بن گیا۔ وہاں سے برلن پہنچا، جہاں وہ انڈین نیشنل پارٹی کا ممبر بن گیا۔ بعد میں جرمن ترک مشن کے ہمراہ کابل کو روانہ کیا گیا۔ راجہ مہندر پرتاپ اور عبیداللہ کے ساتھ افغانستان میں ہے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ افغانستان کو برطانیہ کے خلاف جنگ پر اُکسانے میں مصروف ہے۔ حضرت مولانا کے نام اپنے خط میں عبیداللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں وہ لیفٹیننٹ جنرل ہے۔ جس خط میں حکومتِ مؤقتۂ ہندیہ کی تفصیل دی گیء ہے، اس میں بھی اس کا ذکر ہے۔'' (شخصیت نمبر 72، ص 417)

لوزان کانفرنس کے اختتام کے بعد مولانا برکت اللہ پیرس چلے گئے اور وہاں سے ایک اخبار ''الاصلاح'' کے نام سے جاری کیا۔ اس کے بعد مولانا برکت اللہ کو فرانس کی پولیس اپنی حراست میں لے کر سوئٹزرلینڈ چھوڑ آئی۔ اور انھوں نے وہاں ایک چھوٹے سے گاؤں ''سینی گاسن'' میں سکونت اختیار کی۔ وہاں سے مولانا کچھ عرصے بعد روما تشریف لے گئے اور مسولینی سے ملاقات کی۔ کچھ عرصے بعد وہ پھر برلن آئے۔ جون 1927ء میں انھوں نے امریکا کا سفر کیا۔ آخر 27/ستمبر 1927ء کو مولانا کا ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان

www.rahimia.org

فرانسسکو میں انتقال ہوا۔ اور عارضی طور پر تدفین کی گئی کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد وہاں لے جا کر دفن کر دیا جائے گا۔ (تفصیل ماخوذ از کتاب ''نقیبِ انقلاب مولانا برکت اللہ بھوپالی''، از شفقت رضوی، طبع: پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی)

31۔ جناب موسیٰ کاظم بے: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جنودِ ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے۔ ایک تُرک فوجی افسر ہے، جس کو قسطنطنیہ سے تُرک جرمن مشن کے ساتھ انور پاشا نے خاص طور سے روانہ کیا تھا۔'' (شخصیت نمبر 115، ص 437) ان کے بارے میں مزید معلومات نہیں مل سکیں۔

32۔ امیر صاحب: ان سے مراد سلطنتِ کابل کے حکمران امیر حبیب اللہ خان ہیں۔ ان کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں: ''اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کی پرائیویٹ زندگی سے قطع نظر کر لیا جائے تو انھیں ''شاہِ اصلاح پسند'' کہنا چاہیے۔ ہمیں اپنی اس رائے کے اظہار میں کوئی تأمّل نہیں کہ اگر امیر عبدالرحمٰن کے بعد امیر شہید جیسا بادشاہ برسرِ اقتدار نہ آتا تو افغانستان میں کبھی بھی موجودہ ترقی کا دَور جاری نہ ہوسکتا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے دو مدرسے؛ حبیبیہ اور حربیہ اور دو شفا خانے؛ ملکی اور نظامی نئے طریقے پر بنائے۔ ...امیر حبیب اللہ خاں (20 ر فروری 1919ء کو) قتل کر دیے گئے۔ اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گئے۔'' (کابل میں سات سال، ص 31)

33۔ معین السلطنت عنایت اللہ خان: ان سے مراد امیر حبیب اللہ خاں کے بڑے صاحبزادے سردار عنایت اللہ خاں ہیں، جو کابل حکومت میں ''معین السلطنت'' کے عہدے پر فائز تھے۔ (کابل میں سات سال، ص 33)

34۔ معین الدولہ: ان سے مراد امیر حبیب اللہ خاں کے منجھلے صاحبزادے سردار امان اللہ خاں ہیں، جو ''معین الدولہ'' کے لقب سے حکومتِ کابل میں دخیل تھے۔ (کابل میں سات سال، ص 33)

35۔ حضرت چار باغی یعنی معصوم ضیاء: ان سے مراد سلسلۂ مجددیہ کے پیر معصوم ضیاء ہیں، جو چہار باغ، کابل کے رہنے والے تھے اور پھر مکہ معظّمہ میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ ان کے بارے میں مولانا سندھیؒ ''کابل میں ہمارے سات سال'' میں لکھتے ہیں: ''یہ عجب بات دنیا سنے گی کہ حضرت صاحب چہار باغ (معصوم ضیاء) کو جو معین السلطنت (سردار عنایت اللہ خان) کے مرشد تھے، انگریزوں نے مکہ معظّمہ سے اس خدمت کے لیے بلایا۔ اور معین السلطنت کو اپنی قوم اور مذہبی فیصلے سے علاحدہ رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور یوں خواب سنائے کہ: ''رسولِ کریم ﷺ نے مجھے مامور کیا ہے کہ مَیں اس کام کو پورا کروں۔'' (کابل میں سات سال، ص 98) ان کے بارے میں مولانا عبداللہ لغاریؒ لکھتے ہیں کہ: ''انگریزوں نے ایک چال چلی کہ عنایت اللہ خان معین السلطنت حضرت چہار باغ، جو ہجرت کر کے مکہ معظّمہ میں چلے گئے تھے، ان کو انگریزوں نے مکہ معظّمہ سے بلا کر اس کام پر متعین کیا کہ تم عنایت اللہ خان کو کہو کہ مجھ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہوا ہے کہ افغانستان کو اس جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے آ کر عنایت اللہ خان کو سمجھایا کہ اگر اس جنگ میں افغانستان شریک ہوا تو وہ ختم ہوجائے گا۔ حضرت صاحب چہار باغ اچھے صوفی تھے، مگر انگریزوں کے دام میں آ گئے، جس طرح تمام پیر ہوتے ہیں۔ ...اسی طرح سادی طبیعت والے پیر غداریاں کرتے رہتے ہیں۔'' (مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سرگزشتِ کابل، ص 77-176)

36۔ مستوفی الممالک: ان سے مراد مرزا محمد حسین ہیں، جو کابل حکومت میں وزیرِ مالیات کے طور پر کام کرتے رہے۔ ان کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں: ''ایک عرصے کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک (وزیرِ مالیات مرزا محمد حسین) کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی امداد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوال کی حفاظت میں رہے۔ ہمارا ایک رفیق اس مجلس سے بھاگ گیا اور انقلابِ روس کے بعد بخارا پہنچا۔ اس کا نام رحمت علی زکریا ہے۔ اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلا دی تھی۔ اس کو ہم منع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا تمام الزام ہم پر عائد کیا جائے گا۔ اس لیے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کے توسط سے ان لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی۔ مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے۔ ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں (20 ر

فروری 1919ء کو) قتل کر دیے گئے۔ اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گئے۔'' (کابل میں سات سال، ص95)

37۔ کپتان تیجا سنگھ: راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ شریک تھا۔ اپنے نام کے ساتھ ''آزاد'' لکھتا تھا۔ ترک جرمن مشن کے سلسلے میں راجہ صاحب جب کابل آئے تو اُن کے ساتھ رہا۔ پھر ترکی میں حضرت سندھی کے ساتھ رہا۔

38۔ غازی مشہور ملک مہمنداں کامل خان: مہمند قوم کا سردار ہے۔

39۔ کوہستان مُلاّ: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔ صوات (سوات) میں سنڈاکے مُلاّ اور دوسرے مقامات میں کوہستانی مُلاّ یا فقیر کے نام سے مشہور ہے۔ ستمبر 1915ء میں صوات میں برطانوی فوجوں پر حملہ کرنے کے لیے اس نے صواتی (سواتی) لوگوں کا لشکر جمع کر لیا تھا۔'' (شخصیت نمبر 121، ص439)

40۔ مولوی کمال الدین آفریدی: ان کے بارے میں معلومات دریافت نہیں ہو سکیں۔

41۔ مولوی صادق کراچی: ان سے مراد حضرت مولانا محمد صادق کھڈہ کراچی ہیں۔ ان کی ولادت ۲۵/محرم الحرام ۱۲۹۱ھ/ 15/ مارچ 1874ء کو کھڈہ کراچی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی۔ 1894ء میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ جلد ہی ان کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے خصوصی تلامذہ میں ہونے لگا۔ جون 1895ء میں دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے والدِ گرامی کی نگرانی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں تدریسی کام میں مشغول ہو گئے۔ 1914ء میں والدِ گرامی کی وفات کے بعد مدرسے کے مہتمم مقرر ہوئے۔

''جمعیۃ الانصار'' کے کراچی مرکز کی نگرانی مولانا محمد صادقؒ نے کی۔ اس مرکز نے نہ صرف کراچی اور اس کے گردونواح میں حریت و آزادی کی شمعیں روشن کیں، بلکہ بلوچستان کے علاقوں میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ 1916ء میں مولانا محمد صادقؒ نے لسبیلہ بلوچستان میں مینگل قوم کے ذریعے بغاوت کرادی۔ مولاناؒ نے فتویٰ جاری کیا کہ: ''انگریز فوج میں بھرتی ہو کر ترکوں سے جنگ لڑنا کفر ہے۔'' اس بغاوت کی وَجہ سے انگریزوں کو بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچوں میں حریت و آزادی کی روح پھونکنے کی پاداش میں مولاناؒ کو 3 سال تک پونہ شہر کی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد جمعیت علمائے ہند کے قیام کے موقع پر اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ جمعیت علمائے سندھ کے پہلے صدر تھے۔ سندھ کی سطح پر سیاسی سرگرمیوں اور عام و خاص کی تربیت میں جمعیت علمائے سندھ نے بھرپور کردار ادا کیا۔ تحریکِ شیخ الہندؒ کا مرکز مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ لیاری ان سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ تحریکی سرگرمیوں میں مولاناؒ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور امام انقلابؒ سے محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کے پیش کیے گئے آزادی کے نظریے کے مطابق عمل کرتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ضعف و کمزوری میں مبتلا ہو گئے۔ مولاناؒ 18/ جون 1953ء بروز جمعرات کو عالمِ بقا کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔ ان کا مزار کراچی میں کھڈہ لیاری کے قبرستان میں مرجعِ خلائق ہے۔

42۔ پیر صاحب دین پور: ان سے مراد شیخ ابوالسراج غلام محمد دین پوریؒ ہیں۔ آپؒ کے والدِ گرامی کا نام حاجی نور محمد تھا۔ آپؒ کا خاندان ''اکیانہ بلوچ'' کے نام سے مشہور ہے، جو دریائے جہلم کے کنارے ضلع جھنگ میں مغلوں کے زمانے سے آباد ہے۔ اسی خاندان کے ایک سردار حاجی نور محمد خان ہیں۔ آپؒ کی پیدائش ان کے ہاں ۱۲۵۱ھ/ 1835ء میں موضع عالمے خان شرقی، ضلع جھنگ میں ہوئی۔ بچپن میں ہی آپؒ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بچپن میں ہی بستی مولویان ضلع رحیم یار خان میں مولوی شریف اللہ مرحوم کے خاندان میں آ گئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں کے مدرسے میں مولوی فقیر اللہ صاحبؒ سے حاصل کی۔ اور پھر وہیں حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق سے بیعت ہوئے اور اُن سے تربیت حاصل کی اور تقریباً 28 سال ان کی خدمت اور صحبت میں رہے۔ حضرت سید العارفینؒ نے آپؒ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ آپؒ نے تقریباً 1876ء میں خان پور کٹورہ کے نزدیک ایک بستی میں قیام کیا، جو بعد میں دین پور کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپؒ سے بہت زیادہ فیض جاری ہوا۔ 1888ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اسلام لانے کے بعد سب سے پہلے دین پور میں آپؒ کی خدمت میں آئے اور انھی کے ذریعے سے حضرت سید العارفین مولانا حافظ محمد صدیقؒ سے بیعت ہوئے۔ آپؒ کی ایک شادی حضرت

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے ڈاکٹر ظہیرالحق دین پوری پیدا ہوئے۔ آپؒ نے حضرت سندھیؒ کے تمام کاموں کی سرپرستی فرمائی اور خاص طور پر تحریک ریشمی رومال کے لیے بھی انتہائی جدوجہد اور کوشش کی۔ ستمبر 1916ء میں انھیں تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں گرفتار کر کے جالندھر شہر میں نظر بند کر دیا گیا۔ حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے ''نقشِ حیات'' میں تحریر کیا ہے کہ: ''حضرت دین پوریؒ کی گرفتاری کی وجہ سے عوام میں اس قدر اشتعال پیدا ہوا کہ حکومتِ برطانیہ کو انھیں رہا کرنا پڑا۔''

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''پسر حاجی نور محمد۔ یہ خاندان ابتدا میں ضلع جھنگ کے مقام اہلما میں رہتا تھا، لیکن پچاس برس گزرے ریاست بہاول پور میں متوطن ہوگیا تھا۔ مولوی غلام محمد دین پور، علاقہ بہاول پور میں 18، 19 برس سے مقیم ہے۔ وہ ایک بااثر پیر ہے۔ اس کے پیرو کافی زیادہ تعداد میں مغربی پنجاب، سندھ اور بہاول پور میں ہیں۔ غلام محمد اور عبیداللہ دونوں مرحوم پیر محمد صدیق آف بھرچونڈی ضلع سکھر (سندھ) کے مرید ہیں۔ مولوی غلام محمد پیر محمد صدیق کا بھی خلیفہ ہے۔ مولوی عبداللہ سندھی جو مارچ 1916ء میں عبیداللہ اور بعض دوسرے ہندوستانی سازشیوں کے خطوط لے کر ہندوستان آیا تھا، اس کو ہدایت تھی کہ پیر غلام محمد کو افغانستان لائے، لیکن آخر الذکر سفر کی مشکلات اور دُشواریوں کی وجہ سے یہ سفر نہیں کر سکا، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے امیر کو خط لکھا تھا کہ اس نے حلف لے لیا ہے اور جب بھی ہندوستان پر حملہ ہوگا، وہ ہر امکانی مدد کرے گا۔ بلوچستان میں 1915ء میں جو جنگ ہوئی، وہ اس کی کوششوں کا نتیجہ بیان کی جاتی ہے، لیکن اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔ ستمبر 1916ء میں اس کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ کچھ عرصے تک اسے جالندھر کے گاؤں نور محمد میں پابند رکھا گیا تھا۔ اب وہ بہاول پور کے مقام دین پور میں ہے، جہاں اس کی نقل و حرکت پر پابندی ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔'' (شخصیت نمبر 86، ص 424)

آپؒ نے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں بھی بہت زبردست حصہ لیا۔ جمعیت علمائے ہند کی جدوجہد میں بھی آپؒ شریک ہوئے۔ حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ کا انتقال ۳۰ر ذوالحجہ ۱۳۵۴ھ/ 24 مارچ 1936ء کو دین پور شریف میں ہوا اور وہیں آپؒ کا مزار ہے۔ (یدِ بیضا۔ سوانح عمری حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ)

43۔ اپنے داماد: ان سے مراد حضرت مولانا عبدالقادر دین پوریؒ ہیں، جو حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے داماد اور ان کے خاص دستِ راست تھے۔ ان کے والدِ گرامی کا نام دولت خان تھا۔ ان کا آبائی وطن ٹبی کوراياں ضلع رحیم یار خان تھا۔ یہ امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے استاذ بھی ہیں۔ حضرت سندھیؒ نے ابتدائی عربی صرف و نحو کی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں۔ یہ بھی تحریکِ ریشمی رومال کے اہم ترین رُکن رہے ہیں۔ انھیں حضرت مولانا غلام محمدؒ کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''مولوی غلام محمد ساکن دین پور (ریاست بہاول پور) کا داماد۔ عبیداللہ کا پہلا معلم۔ یقین ہے کہ اس نے اور اس کے خسر نے مولوی عبیداللہ سے اور حیدر آباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم سے جس کو تشریحی ریشمی خط بھیجا گیا تھا، اپنا تعلق قائم رکھا ہے۔ ستمبر 1916ء میں گرفتار کیا گیا۔ کچھ عرصے تک اس پر پابندی تھی کہ سرساس رہے۔ اب دین پور میں ہے، جہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ کرنل ہے۔'' (شخصیت نمبر 48، ص 406) مولانا عبدالقادر دین پوریؒ کا انتقال 20 مارچ 1949ء کو دین پور میں ہوا اور وہیں قبرستان میں مدفون ہیں۔

44۔ مولوی احمد علی (لاہوری): ان سے مراد شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ہیں۔ آپؒ قصبہ جلال ضلع گوجرانوالا میں شیخ حبیب اللہ کے گھر میں ۲ر رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ/ 1887ء بروز جمعہ کو پیدا ہوئے۔ والدِ محترم نے بچپن میں ہی دین کی خدمت کے لیے وقف کر کے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سپرد کر دیا۔ آپؒ کی پوری تعلیم و تربیت حضرت سندھیؒ نے کی۔ مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا میں آپؒ تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ پھر نظارۃ المعارف القرآنیہ میں کام کیا۔ تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ حضرت لاہوریؒ کے بارے میں ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں تحریر ہے: ''احمد علی مولوی نائب ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ، پسر شیخ حبیب اللہ آف بابو چک ضلع گوجرانوالا۔ سندھ میں مولوی عبیداللہ کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ تکمیل تعلیم کے بعد مدرسہ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع

www.rahimia.org

حیدرآباد سندھ میں استاد مقرر کیا گیا۔ بعد میں اس کو اسی عہدے پر نواب شاہ میں عبیداللہ کے قائم کردہ دوسرے اسکول میں منتقل کردیا گیا۔ جب دلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم ہوا تو کچھ دن احمد علی طالبِ علم رہا، لیکن وہ جلد ہی پروفیسر بن گیا۔ بالآخر اسے نظارۃ المعارف کا ناظم بنا دیا گیا۔ مولوی عبداللہ (لغاری) سندھی کابل میں مولوی عبیداللہ سے جو فتاویٰ اور خطوط لایا تھا، وہ ایم احمد علی کے لیے تھے، جس نے تمام خطوط وغیرہ مکتوب الیہم میں ٹھیک تقسیم کرادیے تھے۔ اس کا رابطہ محی الدین عرف برکت علی بی۔ اے آف قصور، خواجہ عبدالحیٔ آف گورداس پور، ڈاکٹر صدرالدین، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی وغیرہ وغیرہ سے تھا۔ لاہون ضلع گورداس پور سے اسے آنے جانے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ بعد میں ضمانت پر اسے مارچ 1917ء میں رہا کردیا گیا تھا۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں وہ کرنل ہے۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ایم احمد علی اتحادِ اسلامی کی سازش جہاد کا ایک سرگرم ممبر تھا۔ نظارۃ المعارف میں اس کی رہائش گاہ وقتاً فوقتاً سازشیوں کے لیے ملنے اور سازشیں گھڑنے کے لیے مرکز کا کام دیتی تھی اور آزاد علاقے کو جانے اور وہاں سے آنے والے سازشی اس میں ٹھہرا کرتے تھے۔'' (شخصیت نمبر11، ص 391) حضرت لاہوریؒ نے لاہور میں مستقل قیام کے بعد شیرانوالا گیٹ میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا اور انجمن خدام الدین کی بنیاد ڈالی۔ پھر تحریکِ ہجرت، تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں سرگرم کردار ادا کیا۔ جمعیت علمائے ہند میں کام کرتے رہے۔ لاہور میں دورۂ تفسیر قرآن حکیم کا سلسلہ قائم کیا۔ آپؒ کا انتقال ۱۷رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ/ 23رفروری 1962ء کو لاہور میں ہوا۔ قبرستان میانی صاحب میں آپؒ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

45۔ مولوی عبداللہ (لغاری) سندھی: مولانا عبداللہ لغاریؒ کے والد نہال خان ولد محمد خان لغاری تھے۔ آپؒ ۱۲۸۸ھ/ 1871ء میں بمقام داد لغاری، تحصیل میرپور ماتھیلو، سندھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی یعقوب سے حاصل کی اور پھر ملک کے بڑے علما سے تمام علوم حاصل کیے۔ ان کا حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے امروٹ شریف کے قیام میں تعارف ہوا اور اس کے بعد سے حضرت سندھیؒ کے رفیقِ کار بن گئے۔ جب حضرت سندھیؒ نے مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیرجھنڈا قائم کیا تو اس کا مہتمم انھیں مقرر کیا گیا۔ چناں چہ حضرت سندھیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے کے مطابق 1914ء تک اس مدرسے کو چلاتے رہے۔ پھر 1915ء میں حضرت سندھیؒ کے ساتھ کابل تشریف لے گئے۔ وہاں سے حضرت سندھیؒ کے خصوصی خطوط لے کر ہندوستان آئے اور یہاں تحریکِ ریشمی رومال کے حوالے سے مفوّضہ ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے۔ تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''عبداللہ مولوی آف سندھ پسر نہال خاں، ساکن موضع گوٹھ ملاں بخش نواری، تھانہ (میرپور) متھیلو، ضلع سکھر۔ پیر غلام محمد آف دین پور ریاست بہاول پور کا مرید ہے۔ کچھ عرصے تک گوٹھ پیرجھنڈا اسکول تحصیل ہالا ضلع حیدرآباد سندھ میں فارسی کا استاد رہا ہے۔ جولائی 1915ء میں مولوی عبیداللہ کے ہمراہ کابل گیا تھا۔ فروری 1916ء میں کچھ خاص سازشیوں کے لیے خطوط لے کر ہندوستان آیا تھا۔ خطوط پہنچانے کے بعد وہ کابل واپس نہیں گیا۔ ستمبر 1916ء میں اس کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس نے بڑا اہم بیان دیا ہے۔ اس کو اپنے گاؤں سے باہر جانے کی ممانعت ہے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔'' (شخصیت نمبر40، ص403)

جب مولانا عبیداللہ سندھی مکہ معظّمہ پہنچے تو مولانا عبداللہ لغاریؒ بھی ان کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ وہاں مولانا سندھیؒ کی بیان کردہ تفسیر قرآن حکیم کو ''المقام المحمود'' کے عنوان سے اور ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' پر حضرت سندھیؒ کی تقاریر کو عربی میں ''رحمةُ اللّٰهِ الواسعه'' کے نام سے قلم بند کیا۔ اسی طرح حضرت سندھیؒ کی تحریر ''کابل میں سات سال'' کی شرح بھی ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سرگزشتِ کابل'' کے نام سے قلم بند کرائی۔ مولانا لغاریؒ چھ سال تک سندھ یونی ورسٹی میں قرآن پاک کی تفسیر' ولی اللّٰہی حکمت کی روشنی میں پڑھاتے رہے۔ اس دوران ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کے گھر قیام رہا۔ اسی دوران بیمار ہوئے اور۴ر ربیع الاوّل ۱۳۷۸ھ/ 17ر ستمبر 1958ء کو حیدرآباد میں انتقال فرما گئے۔ آپؒ کی تدفین سانگھڑ میں ہوئی۔ (مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سرگزشتِ کابل'' ص 263)

46۔ مولانا خلیل احمد: ان سے مراد حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری قدس سرہٗ ہیں۔ آپ صفر ۱۲۶۹ھ/ دسمبر 1852ء میں قصبہ انبہٹہ

www.rahimia.org

ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی قدس سرہٗ ان کے نانا ہیں۔ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی قدس سرہٗ (بانی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور) اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند ان کے ماموں ہیں۔ پہلے دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے ماموں حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے پاس مظاہر العلوم سہارن پور سے ۱۲۸۸ھ/ 1871ء میں تعلیم مکمل کی۔ درس و تدریس کے سلسلے میں منگلور، بھوپال، بہاول پور، بریلی اور دار العلوم دیوبند میں رہے۔ آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں صدر مدرّس اور پھر سرپرست بنے۔ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفا میں سے تھے۔ تحریک ریشمی رومال کے ان اکابر ثلاثہ میں سے تھے، جنھوں نے پوری جامعیت کے ساتھ شریعت، طریقت اور سیاست کے شعبوں میں رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''خلیل احمد مولانا عرف خلیل الرحمٰن آف مدرسہ اسلامیہ سہارن پور۔ ایک بہت معزز و محترم مولوی، جس کے مریدوں کی تعداد ہندوستان بھر میں بہت زیادہ ہے۔ موضع انبیٹھہ ضلع سہارن پور کا رہنے والا ہے اور مولوی محمد میاں عرف مولوی منصور کا قریبی رشتہ دار ہے۔ ہندوستانی علما میں شاید یہ واحد شخص ہے، جو مولانا محمود حسن سے ہجرت کے سوال پر متفق تھا۔ ایس ایس جہاز کے ذریعے عرب گیا۔ ستمبر 1915ء کے شروع میں وہاں پر قیام کے دوران یہ مولانا محمود حسن کی سیاسی سازش میں شامل ہوگیا اور غالب پاشا کے معاملے میں بھی شامل رہا۔ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ مکہ کے دھرم پور رباط میں جہاد سے متعلق مذاکرات میں شامل ہوا کرتا تھا۔ جب انور پاشا اور جمال پاشا ترک افواج کی کامیابی کے لیے دعا کرنے مدینہ آئے تو مولوی خلیل احمد بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ پاشاؤں نے اس کو نذر پیش کی۔ 8/ستمبر 1916ء کو ایس ایس اکبر نامی جہاز کے ذریعے ہندوستان واپس ہوا۔ بمبئی میں اُترتے ہی گرفتار کرلیا گیا۔'' (شخصیت نمبر 116، ص 437) حضرت سہارن پوریؒ کو بمبئی سے گرفتار کرکے نینی تال جیل میں قید کردیا گیا۔ کچھ عرصہ وہاں گرفتار رہے۔ پھر حضرت مولانا محمد احمد مہتمم دارالعلوم کی گورنر سے ملاقات کے بعد ان کو رہائی ملی۔ (حیاتِ شیخ الہندؒ از مولانا سیّد اصغر حسین دیوبند، ص 47) مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ نے ۱۵/ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ/ 12/اکتوبر 1927ء بروز بدھ کو مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ (حیاتِ خلیل، مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی، مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ)

47۔ مہتممینِ مدرسہ دیوبند: ان سے مراد حضرت مولانا حافظ محمد احمد (۱۲۷۹ھ/ 1862ء - ۱۳۴۷ھ/ 1928ء) مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (وفات ۴/رجب ۱۳۴۸ھ/ 1929ء) نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں۔

48۔ مولوی شبیر احمد: ان سے مراد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ہیں۔ آپؒ کے والدِ گرامی کا نام مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ہے۔ آبائی وطن دیوبند ہے۔ آپؒ کی ولادت ۱۰/محرم الحرام ۱۳۰۵ھ/ 1889ء کو بجنور میں ہوئی، جہاں آپؒ کے والدِ گرامی ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے۔ آپؒ کے والدِ گرامی نے آپؒ کا نام فضل اللہ رکھا تھا، جب کہ آپ کی شہرت شبیر احمد کے نام سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر ۱۳۲۵ھ/ 1907ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرّس مقرر ہوئے۔ پھر ۱۳۲۸ھ/ 1910ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرّس مقرر ہوئے۔ جہاں جمعیت الانصار کے اجلاسات میں آپؒ نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور حکمتِ ولی اللّٰہی پر ان کے بڑے بڑے مفصل خطابات ہوئے۔ ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''شبیر احمد مولوی۔ مطلوب الرحمٰن کا بھائی ہے اور دیوبند کے مدرسے میں ملازم ہے۔ دوسرے بھائی یعنی حبیب الرحمٰن اور مفتی عزیز الرحمٰن بھی مدرسے کے عملے میں شامل ہیں۔ پہلے وہ فتح پوری اسکول دہلی میں مولوی فضل الرحمٰن کے ساتھ تھا، لیکن ان کا ساتھ نہیں نبھ سکا۔ چناں چہ شبیر احمد دیوبند کے مدرسے میں آ گیا۔ وہ بڑا فاضل مولوی ہے۔ اس نے ترکی کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے میں جنگِ بلقان کے دوران بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور اسلامی سیاست میں وہ زبردست دلچسپی لیتا ہے۔ وہ مولانا محمود حسن کی جہاد کی اسکیم کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ اور اگر اسے حبیب الرحمٰن اور مفتی عزیز الرحمٰن نہ روکتے تو وہ ستمبر

www.rahimia.org

1915ء میں مولانا کے ساتھ ہجرت کرنے والوں میں ضرور شامل ہو جاتا۔ شبیر احمد شروع میں مولانا عبیداللہ کے ساتھ دوستی رکھتے تھے، لیکن بعد میں سخت دشمن ہوگئے اور دیوبند سے ان کے اخراج کے خاص ذمہ دار وہی ہیں۔'' (شخصیت نمبر200، ص76-475)

اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تحریکِ خلافت اور جمعیت علمائے ہند میں بھی کام کرتے رہے۔ 1946ء میں جمعیت سے اختلاف کرکے جمعیت علمائے اسلام قائم کی اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی دستور ساز اسمبلی کے رُکن اور دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ آخری زمانے میں جامعہ عباسیہ بہاول پور کے تعلیمی نظام کی مشاورت کے لیے بہاول پور آئے ہوئے تھے کہ اچانک ۲۱/صفر ۱۳۶۹ھ/ 13/دسمبر 1949ء کو چند گھنٹے بیمار رہ کر وفات پا گئے۔ آپ کا جسدِ خاکی بہاول پور سے کراچی لے جایا گیا اور اسلامیہ کالج کے احاطے میں آپؒ کی تدفین عمل میں آئی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد دوم)

49۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس مشن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: ''پہلے مشن کی کامیابی میں راجہ (مہندر پرتاپ) صاحب (صدر حکومتِ مؤقتۂ ہند) نے دو مشن اُور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہمارے منشا کے مطابق استنبول بھیجا گیا۔ اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی۔اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے۔ یہ ایران کے راستے استنبول گیا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی۔اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے سے جاپان گئے...۔ روس نے دوسرے مشن کو جب وہ اُن کی سرحد عبور کر چکا تو گرفتار کرلیا اور انگریزوں کے حوالے کردیا۔ استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کیا۔ (اس طرح ہمارے) چار ممبر لاہور پہنچے: (۱) ڈاکٹر متھرا سنگھ چوں کہ ایک بم کیس میں مفرور تھا، اسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور باقی تین ممبر نظر بند کردیے گئے۔ (۲ ان میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقع پر ہمارے ساتھ اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا، سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا۔ اسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا۔ اس نے تمام واقعات حکومتِ مؤقتہ کے اور جنودُ اللہ اور جماعتِ مجاہدین کے مفصل لکھ دیے۔ (۳،۴)اور باقی دو ممبروں (ڈاکٹر شجاع اللہ اور شیخ عبدالقادر بی۔اے) نے اس پر دستخط کردیے۔ کچھ عرصہ اُسے نظر بند رکھ کر اُسے چھوڑ دیا گیا۔ حکومتِ ہند روسی مشن کے زمانے سے واقعات کی تحقیق کے لیے پریشان تھی۔ اب اسے (ان لوگوں کے ذریعے سے) بہ اطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔'' (کابل میں سات سال، ص86-84)

50۔ مولوی عبدالقادر شہید ایم۔اے: ''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''عبدالقادر شیخ مہاجر۔ پسر مولوی شیخ احمد دین بی۔اے، اسسٹنٹ انسپکٹر آفس اسکولز، ساکن قلعہ خزانہ، پولیس اسٹیشن صدر گوجرانوالا، ضلع گوجرانوالہ۔ لاہوری جہادی طلبا میں سے ایک ہے۔ (گورنمنٹ کالج لاہور) فروری 1915ء میں بھاگ کر مجاہدین کے پاس چلا گیا تھا۔ کابل میں خاص بڑے سازشیوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ عبدالقادر کو ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ سیستان میں گرفتار کرلیا گیا تھا، جب کہ وہ کابل کی انقلابی پارٹی کی طرف سے کسی خفیہ مشن پر چین اور جاپان جا رہے تھے۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔ اب لاہور میں گرفتار ہے۔'' (شخصیت نمبر50، ص407) شیخ عبدالقادر کے بارے میں اُن کے ایک کلاس فیلو غلام مرتضٰی قریشی اپنے ایک مکتوب بنام مصنف ''یدِ بیضاء'' تحریر کرتے ہیں کہ: ''شیخ عبدالقادر مرحوم ایم ایس سی کے آخری سال میں تھے۔... بدقسمتی سے میاں عبدالباری، شجاع اللہ اور شیخ عبدالقادر انگریزوں کے حلیفوں کے ہتھے چڑھ گئے اور پابہ جولاں ہندوستان لائے گئے۔ جیل کی تکالیف سے شیخ عبدالقادر جو نحیف البدن تھے، تھوڑا عرصہ بیمار رہ کر شہید ہوگئے۔'' (یدِ بیضاء، سوانح حضرت خلیفہ غلا محمد صاحب دین پوریؒ، تصنیف: میاں خلیل احمد، ص151، طبع: خانقاہ دین پور شریف، ضلع رحیم یار خان، طبع ہشتم: 2013ء)

51۔ ایک سکھ: ان سے مراد ڈاکٹر متھرا سنگھ ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت سندھیؒ کی تحریر گزر چکی ہے۔

52۔ منصور: ان سے مراد حضرت مولانا محمد میاں انصاری ہیں، جو اس خط کے مکتوب نگار ہیں۔ آپؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے اور حضرت مولانا محمد عبداللہ انصاریؒ کے فرزندِ اکبر ہیں۔ ان کا آبائی وطن انبیہٹہ تھا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں حاصل کی، جہاں ان کے والد ماجد صدر مدرّس تھے۔ ۱۳۲۱ھ/ 1903ء میں دارالعلوم دیوبند سے تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ کچھ

عرصہ دارالعلوم معینیہ اجمیر شریف میں مدرّس رہے۔ پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے ترجمہ قرآن کے کام میں انھیں دیوبند بلا لیا۔ جمعیت الانصار قائم ہوئی تو مولانا سندھیؒ کے ساتھ اس کے نائب ناظم مقرر ہوئے۔ 1915ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حجاز میں ہمراہ تھے اور مدینہ منورہ کے گورنر غالب پاشا کا خط لے کر افغانستان پہنچے اور تحریکِ ریشمی رومال میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

''ریشمی خطوط ڈائریکٹری'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر ہے: ''محمد میاں مولوی عرف مولوی منصور۔ جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے۔ تشریحی ریشمی خط بہ نام شیخ عبدالرحیم حیدر آباد سندھ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ مولوی محمد میاں، مولوی عبداللہ پروفیسر دینیات ایم اے او کالج علی گڑھ کا لڑکا اور شمس العلما حافظ احمد پرنسپل مدرسہ دیوبند کا بھانجا ہے۔ وہ انبیٹھہ ضلع سہارن پور کا باشندہ ہے۔ اس نے دیوبند میں تعلیم پائی ہے۔.. تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ کچھ عرصے تک نگینہ میں ملازم رہا۔ بعد میں دارالعلوم دیوبند میں ملازم رکھ لیا گیا، جہاں وہ مولانا محمود حسن کا مرید ہوگیا۔ اسے ان سے گہری وابستگی ہے۔ وہ سازش کا اہم رُکن ہے۔ دیوبند میں خفیہ جلسوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ ستمبر 1915ء میں مولانا محمود حسن کے ہمراہ حجاز گیا۔ جماعت کے خازن کے طور پر کام کیا۔ اپریل 1916ء میں ''غالب نامہ'' ساتھ لے کر واپس آیا، جو ہندوستان میں اور آزاد علاقے میں سازشیوں کو دکھانے کے بعد وہ کابل لے گیا، جہاں وہ جون 1916ء میں پہنچا۔ ابھی تک وہ عبیداللہ وغیرہ کے ساتھ کابل میں ہے۔ شاید حضرت مولانا (محمود حسن) کے نام خط اسی نے تحریر کیا ہے۔'' (شخصیت نمبر 161، ص 56-455)

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری اور تحریکِ ریشمی رومال کے اختتام کے بعد مولانا منصور انصاریؒ افغانستان چلے گئے اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہوگئے۔ حکومتِ افغانستان پر اُن کے علم و فضل اور سیاست و تدبر کا بڑا اثر تھا۔ چناں چہ حکومتِ افغانستان نے اپنا جو سفارتی مشن ترکی بھیجا تھا تو انھیں وزیرِ مختار کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا۔ اسی طرح ماسکو کے سیاسی مشن میں بھی اُن کو سیاسی مشیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ افغانستان میں جب بچہ سقہ نے اقتدار پر قبضہ کرلیا تو اُس نے انھیں جلاوطن کردیا۔ چناں چہ اُس کے دورِ حکومت میں آپؒ چند ماہ کے لیے روس چلے گئے تھے۔ پھر جب نادر خان نے بچہ سقہ کو شکست دے کر افغانستان کی حکومت حاصل کی تو مولاؒنا کو واپس بلا لیا۔ قیامِ افغانستان کے زمانے میں آپؒ نے متعدد سیاسی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان کی کتابیں ''حکومتِ الٰہی''، ''اساسِ انقلاب''، ''دستورِ امامت'' اور ''انواع الدول'' ان کی اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا افغانستان میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ آخر عمر میں افغانستان کے مشہور مقام جلال آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہیں ۶/صفر ۱۳۶۵ھ/ 11/جنوری 1946ء کو وفات پائی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور انصاری کو ہندوستان واپس بلا لیں گے، مگر افسوس کہ ہندوستان کی آزادی سے ایک سال قبل سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد دوم، ص 93-91)

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ سیاسیات

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سیاسی بصیرت
('مجذوب سندھی' کی چند الہامی باتیں)

تحریر: حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ
عناوین وحواشی: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ وہ تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں ہندوستان سے کابل، ماسکو، استنبول ہوتے ہوئے حرمین شریفین پہنچے تھے۔ جنگِ عظیم دوم سے ذرا پہلے مولانا سندھیؒ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حرمِ پاک سے ہندوستان آئیں اور اہلِ وطن کو مستقبل میں حاصل ہونے والی آزادی کے تناظر میں نئی فکری اور سیاسی و معاشی حکمتِ عملی تشکیل دینے کی دعوت دیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار سے استفادہ کریں اور معروضی حالات میں جدید دور کے سائنسی اور سائنٹفک طریقۂ کار کو اپنائیں، تاکہ قومی آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے ملک اور قوم کی ترقی کے اقدامات کیے جاسکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سیاسی ترقی اور صنعتی انقلاب کے لیے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق تربیت یافتہ افرادی قوت پیدا کرنا ضروری ہے۔ دوسو سال کی غلامی کی وَجہ سے اس خطے کے لوگوں میں انتظامی امور کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رہی۔ برسوں سیاست اور حکومت کے امور سرانجام نہ دینے سے ان کی سیاسی اور انتظامی صلاحیتوں کو زنگ لگ چکا تھا۔ معاشی وسائل کی کمی بھی انسانی مہارتوں کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔ جب کہ اس دور میں برطانیہ کو ہندوستان پر سیاسی و معاشی تسلط کی وَجہ سے حکومت، سیاست اور معیشت کے میدانوں میں سبقت حاصل ہے۔ نئے صنعتی دور کے تقاضوں کے مطابق عسکری اور سول انتظامی مشینری کی منظّم قوت ان کے پاس ہے۔ ایسے ماحول میں نئی اُبھرتی ہوئی امریکی سامراجی حکومت کے زیرِ تسلط آنے کے بجائے دوسو سال سے اس خطے پر حکومت کرنے والی برطانوی طاقت سے ہی حکومت چلانے کا جدید نظم و نسق اور عسکری اور معاشی امور سنبھالنے کے طور طریقے سیکھ لیے جائیں۔

مولانا سندھیؒ نے ہندوستان آکر اس حوالے سے اپنے مشاہدات و تجربات اور افکار و خیالات بیان کیے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی حقانیت منوا رہے ہیں۔ اُن کے وصال کے تین سال بعد ہی اس خطے کی تقسیم ہوگئی اور دونوں ملکوں کے حالات بہت زیادہ دگرگوں ہوگئے۔ یہاں کے مسلمان مسائل سے دوچار ہوئے۔ ایسے حالات میں مولانا سندھیؒ کے سیاسی تجزیوں اور بیان کردہ الہامی باتوں کی صداقت سامنے آئی۔ اس موقع پر مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے مولانا سندھیؒ کی حقیقت پسندانہ گفتگو کے تناظر میں یہ مختصر مقالہ قلم بند کیا، جسے انھوں نے ماہنامہ ''بُرہان'' دہلی کی اپریل 1950ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ مقالہ نگار نے مولانا سندھیؒ کی دور اندیشی، معاملات کو حقیقت پسندی سے دیکھنے کی صلاحیت اور سیاسی و معاشی حقائق کے درست تجزیے کو خوب واضح کیا ہے۔ اس مضمون میں عنوانات اور حواشی ہمارے ہیں۔ مدیرِ اعلیٰ)

(مفکرین دو قسم کے ہوتے ہیں)

کسی قوم یا ملک کے معاملات و مسائل پر جو لوگ غور کرتے اور اس کی پیچیدہ ترگتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دو قسم کے ہوتے ہیں:

(1۔ روایتی مفکرین)

ایک وہ جو پیش نظر مشکلات و معاملات کا حل سوسائٹی کے عام قوانین اور مروّجہ عوائدِ رسمیہ (رسمی رُکاوٹوں) کی حد بندیوں کے اندر محصور رہ کر سوچتے ہیں اور اس بنا پر ان کی زبان و قلم سے کبھی کسی ایسے فکر کا ترشح نہیں ہوتا، جو لوگوں کے عام معتقداتِ مذہب و افکارِ قومی کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا کر سکے۔ اس قسم کے حضرات سچ مچ غالبؔ کے اس شعر کا مصداق ہوتے ہیں: ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پا بستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

(2۔ انقلابی مفکرین)

اس کے برخلاف مفکرین کا ایک طبقہ ہوتا ہے، جو انقلابی ذہن سے ان مسائل کا حل سوچتا ہے اور اگر اس حل کی راہ میں پُرانے اور مروّجہ رسوم کی کسی خاص ہیئت اور وضع کو صدمہ بھی پہنچتا ہے تو وہ اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتا۔ چوں کہ ہر 'حال' اپنے 'ماضی' کا قدرتی اور طبعی نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے اس قسم کا مفکر ماضی کا مطالعہ بے تعصبی سے غور و خوض کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تحلیل کر کے چند اصول متعین کرتا ہے اور پھر ان اصول کی روشنی میں حال اور اس سے آگے بڑھ کر مستقبل کے معاملات و مسائل پر نگاہ ڈالتا ہے۔

(انقلابی مفکرین کا انداز و اُسلوب)

اس سلسلے میں وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ:

(i) ماضی کی تعمیر کے اصل خدوخال کیا ہیں۔

(ii) اس کی ہیئتِ کذائی میں کن عناصر کو 'عناصرِ حقیقی' کی حیثیت حاصل ہے۔

(iii) اور اس میں کون سی اور کتنی چیزیں ایسی ہیں، جو کسی عمارت میں موسمی تغیرات کی مانند کسی خاص خارجی سبب کے باعث پیدا ہو گئی ہیں۔

(انقلابی مفکرین کی جرأت اور اُفتادِ طبعی)

پھر اس دیدہ وری کے ساتھ اُس میں اتنی جرأت اور جسارت بھی ہوتی ہے کہ وہ درخت کی غیر ضروری اور فضول شاخوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقت شناس، واقعیت پروری کے چہرے کو رسم پرستی کے داغ سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اُس کی طبیعت کی یہ اُفتاد اور اُس کے فکر کا یہ طریق اس کو اس درجے روشن دماغ، عالی حوصلہ اور وسیع النظر بنا دیتا ہے کہ

www.rahimia.org

حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کا (عملی اندازِ) فکر بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس کی طبیعت میں جمود نہیں ہوتا۔ اس کا ذہن رجعت پسندی کے عیب سے پاک ہوتا ہے۔ وہ پُرانی لکیر کا فقیر نہیں بنا رہتا، بلکہ اس کی مثال اس طبیبِ حاذق کی سی ہوتی ہے، جو مرض کی نوعیت اور موسم کے اثرات کے بدلنے سدلنے کے ساتھ نسخے کے اجزا میں بھی ترمیم و تنسیخ کرتا ہے اور ہر مرض کے لیے ایک ہی نسخہ اور ایک دوا تجویز نہیں کرتا۔

اس دوسری قسم کا مفکر ہی درحقیقت ''انقلابی مفکر'' کہلاتا ہے اور پہلی قسم کے مفکر کو ''رجعت پسند'' کہنا چاہیے۔

(موجودہ تاریخ کے واحد انقلابی مفکر)

مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں اسی دوسری قسم کے واحد انقلابی مفکر تھے اور اپنی اس حیثیت میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ اس دور میں جتنے مسلمان زعما اور مفکر پیدا ہوئے، وہ سب مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر خداوندانِ جمعیت علما تک اپنی علمی و عملی کمالات و اوصاف کے باعث مسلمانوں کے خواہ کتنے ہی لائقِ تعظیم و احترام رہنما ہوں، لیکن افسوس ہے انھیں ''انقلابی مفکر'' نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا چوں کہ انقلابی مفکر کے ذہن میں جمود نہیں ہوتا اور وہ عوائدِ رسمیہ (رسمی رُکاوٹوں) کی حد بندیوں سے آزاد ہوکر معاملات و مسائل پر غور کرتا اور اُن کا حل سوچتا ہے، اس لیے ابتداءً سوسائٹی کا مزاج اس کے فکر کو قبول کرنے سے عمومی طور پر انکار کرتا ہے اور رجعت پسند و قدامت پرست طبائع اس پر سبّ و شتم (گالی گلوچ) کی بوچھاڑ شروع کر دیتی ہیں۔ مذہب کی زبان میں گفتگو کرنے والے اس کو 'ملحد' اور 'زندیق' کہتے ہیں۔ سماجی آداب کی اصطلاح میں اس کو 'رند مشرب' یا 'آزاد خیال' کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے، مگر جمودِ ذہنی کے باعث اس کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی بھی نہیں کرتے، وہ کبھی دبے دبے لفظوں میں اور کبھی کھل کر اسے 'مجذوب' یا 'دیوانہ' کہتے ہیں۔ چناں چہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ ہوا۔ کہنے والوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ جو اُن کے سال ہا سال کے رفیق تھے اور مولاناؒ کی دماغی و عملی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے بھی کبھی اُن کو 'مجذوب' کہا اور کبھی 'دیوانہ' کہہ کر پکارا۔ ان حضرات کی رعایت سے ہم نے بھی اس مقالے کے عنوان میں مولانا سندھیؒ کو 'مجذوب سندھی' ہی کہا ہے۔

(مفکرینِ اسلام میں مولانا سندھیؒ کا بلند مقام)

مولاناؒ اپنے افکار کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی انقلابیت کے باعث اسلام کی ماضی قریب کی تاریخ کے تمام مفکرینِ اسلام میں نہ صرف ایک قومی، بلکہ بین الاقوامی مفکر کی حیثیت سے کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں اور ان کے افکار کی بنیاد پر اسلام کو کس طرح ایک کامیاب ترین بین الاقوامی دستورِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے زیرِ اثر دنیا میں کس طرح ایک صالح ترین نظامِ زندگی برپا کیا جا سکتا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب تو آپ کو اس زیرِ تالیف ضخیم کتاب (1) میں ملے گا، جو اگر پوری ہوگئی تو اس پر خاکسار مؤلف کو فخر سے یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!!!

(میں خوش ہوں کہ اپنی زندگی میں مَیں نے ایک کام کیا ہے)

(مولانا سندھیؒ کی صحیح ثابت ہونے والی پیش گوئیاں)

البتہ اس مختصر مقالے میں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں نے جس کو کل 'مجذوب' یا 'دیوانہ' کہا تھا، آج اس کی چند پیش گوئیاں جو ان لوگوں کے نزدیک ''مجذوب کی بڑ'' سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں، کس کس طرح حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ جو لوگ رجعت پسندی کے ساتھ قومی و ملکی معاملات پر سوچ بچار کرتے ہیں، انھیں کیوں کر اپنے منصوبوں میں ناکامی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جو وسیع النظر اور انقلابی ذہن کا مفکر حالات و واقعات کا ہمہ گیر جائزہ لینے کے بعد ان کی رفتار کے بدلنے کے ساتھ اپنے فکر کا طریق اور محاذ بھی بدلتا رہتا ہے، واقعات کے نتائج انجامِ کار کس طرح اس کے فکر کی صداقت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔

1۔ جنگِ عظیم دوم (کی بابت مولانا سندھیؒ کی پیش گوئی)

مولاناؒ ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد (7/ مارچ)1939ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ کراچی اُترے اور وہاں سے سیدھے (5/ اپریل 1939ء کو) دہلی پہنچے۔ دہلی میں 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں قیام پذیر ہوئے۔[2] تعلقِ خاطر کے باعث 'ندوۃ المصنّفین' (نزد جامع مسجد دہلی) کے دفتر میں بھی اکثر تشریف لاتے تھے اور مختلف عنوانات و مباحث پر گفتگو فرماتے تھے۔ ایک دن ارشاد ہوا:

> ''میرے یقین میں ایک جنگِ عظیم عنقریب چھڑنے والی ہے، جس میں روس بھی شریک ہوگا اور اگرچہ جنگی اعتبار سے فتح اس فریق کو ہوگی، جس کا حلیف روس ہوگا، لیکن اس جنگ کے بعد دنیا کا نظام بالکل بدل جائے گا اور کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوگا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے دراصل جیت روس کی ہی ہوگی۔''

میں نے کہا:

> ''مولانا! جرمنی کا کیا ہوگا؟ یہ بھی تو دنیا کی ایک عظیم الشان طاقت ہے اور اگر اٹلی اور جاپان' روس کے حلیف ہو گئے تو کیا یہ سب مل ملا کر بھی فتح حاصل نہ کر سکیں گے؟''

مولاناؒ نے اپنی عادت کے مطابق شانِ جلالی کے ساتھ تپائی پر زور سے ہاتھ مار کر فرمایا:

> ''ہوں! جرمنی! اس نے اگر روس کی مخالفت کی تو پاش پاش ہو جائے گی اور ہٹلر اور مسولینی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔''

پھر پوچھا گیا، مگر مولانا! امریکا اور برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ ارشاد ہوا:

> ''آئیڈیالوجی کے اعتبار سے امریکا، برطانیہ اور روس دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس بنا پر یہ مشکل سے ہی باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے، لیکن جہاں تک سیاسی شاطرانہ چال بازیوں کا تعلق ہے، امریکا اور برطانیہ کو روس پر توفُّق (برتری) حاصل ہے۔ اس لیے بعید نہیں یہ دونوں روس کو اپنے ساتھ ملا لیں اور اس طرح اس کی مدد سے جرمنی کا خاتمہ کر دیں۔''

www.rahimia.org

ساتھ ہی فرمایا:

''ایک اَور بات تمھیں ذہن میں رکھنی چاہیے اور وہ یہ کہ اٹلی اور جرمنی کا نظام ''فاشسٹ'' ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں ''جمہوریت'' قائم ہے۔ اگرچہ یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ ہے، لیکن بہرحال فاشزم کے مقابلے میں بہتر ہے۔ روس کا نظام کمیونزم ہے، جو آئندہ چل کر تاریخ اور وقت کے طبعی تقاضے کے باعث ساری دنیا کا نظام بننے والا ہے۔ اس ترتیب کے اعتبار سے ہونا یہ چاہیے کہ پہلے فاشزم ختم ہو، جو ان تینوں میں سب سے زیادہ بُرا نظام ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کمیونزم میں جنگ ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں جو صالح تر نظام ہوگا، وہ باقی رہ جائے گا اور اس کا حریف ختم ہوجائے گا۔''

یہ گفتگو عصر اور مغرب کے درمیان کی شام کی چائے پر ہو رہی تھی، جو کچھ دیر کے بعد رفت گزشت (آئی گئی) ہوگئی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی (یکم ستمبر 1939ء) جنگ شروع ہوئی تھی۔ ہٹلر کی فوجیں طوفانی برق و باراں کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ مشرقی یورپ کے جس ملک کی طرف اُس نے رُخ کیا، وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر اس کے قدموں پر گرتا چلا گیا۔ صبح ایک ملک کی باری تھی اور شام دوسرے کی۔ دنیا کے بچے بچے کے دل پر ہٹلر کی عظمت اور اس کی ناقابل شکست طاقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ 22/جون 1941ء کو اتوار کے دن صبح کے تین بج کر 5 منٹ پر ہٹلر نے خود اپنی اور نازی فاشزم کی موت کی دستاویز پر دستخط کیے اور (اس نے آپریشن باربار وسا Operation Barbarossa کے عنوان سے) سوویٹ روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اس پر دھاوا بول دیا۔ [3] دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکر اور فوجی ماہر اس وقت جرمنی کی طاقت سے کس درجہ مرعوب تھے؟ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ 25/جون کے ''نیوز کرانکل'' اخبار نے امریکا کے مشہور فوجی ماہر میجر فیلڈنگ الیٹ کا ایک بیان شائع کیا، جس میں انھوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ:

''سوویٹ روس کی فوجی اور فضائی طاقت جو کچھ ہے، ہم کو معلوم ہے۔ اس کے پیش نظر ہرگز اس بات کی توقع نہیں ہوسکتی کہ روس کی سرخ فوج جرمنی کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکے گی۔''

پھر اسی اخبار میں اس صفحے پر جو لیڈنگ آرٹیکل نکلا، اس میں بھی ایڈیٹر نے لکھا تھا:

''جرمنی کے مقابلے میں روس کی شکست یقینی ہے۔ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ موسمِ خزاں تک چلے گی۔''

فوجی ماہرین ومبصرین کے علاوہ خود انگلینڈ میں رائے عامہ کیا تھی؟ ڈین آف کنیٹر بری اپنی مشہور کتاب "The socialist sixth of world" میں لکھتے ہیں:

''روس پر جرمنی کے حملے کے وقت انگلینڈ میں ہر شخص گورنمنٹ اور محکمہ خارجہ کے ذمہ دار افسروں اور عہدے داروں سے لے کر نیچے طبقے کے مزدوروں تک ہر اخبار نویس، ہر فوجی ماہر اس بات کی توقع کرتا تھا کہ سرخ فوج کو مکمل شکست ہوگی اور سوویٹ یونین بالکل تباہ و برباد ہوجائے گی۔''

شروع شروع میں ان لوگوں کا خیال — جو ایک طرف جرمنی سے غیر معمولی مرعوبیت اور دوسری جانب روس اور فن لینڈ کی طرف سے غلط فہمی پر مبنی تھا — صحیح بھی ثابت ہوا۔ چناں چہ جرمنی نے روس کے علاقوں کو پامال کرتے ہوئے بڑی تیزی کے

www.rahimia.org

ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ 6/ اکتوبر 1941ء کو جرمنی فوجوں نے ماسکو کے دروازے پر دستک دی اور ماسکو گورنمنٹ کو وہاں سے (لینن گراڈ) منتقل ہوجانا پڑا۔ اب کسی کو شبہ نہیں تھا کہ نپولین بونا پارٹ بھی جس معرکے کو سرانجام نہیں کرسکا تھا، جرمنی کا فیوھرر (ہٹلر) چند دنوں میں اسے ختم کر کے رکھ دے گا۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مولانا سندھیؒ دفتر ''بُرہان'' میں تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا:

''حضرت! آپ کا یہ خیال تو صحیح نکلا کہ امریکا اور برطانیہ کی شاطرانہ چال کامیاب ہوئی اور اُس نے روس کو بھی جرمنی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا، لیکن آپ جو روس کی طاقت کی طرف سے اس درجہ خوش گمان تھے، وہ تو واقعات کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہا ہے۔ سرخ فوجیں ہر مورچے پر پِٹ رہی اور پسپا ہو رہی ہیں۔ اور ہٹلر کی فوج اُن کے علاقوں کو روندتی ہوئی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔''

مولاناؒ کو اپنے دل و دماغ کے مشاہدے پر ایسا جزم و یقین تھا کہ یہ سنتے ہی بپھر پڑے۔ اور شیر کی طرح گرج کر بولے:

''تم بکتے ہو۔ دیکھ لینا روس کو ہرگز شکست نہیں ہوسکتی۔ غریب ہٹلر کو یا کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ روس کی ریز روڈ فوج کتنی کچھ اور کہاں کہاں ہے۔ سائبیریا کے پہاڑوں میں ان کے میگزین ہیں، جن کی کسی کو ہوا تک بھی نہیں پہنچی ہے۔ یہ پسپائی تو روس کا خاص طریقۂ جنگ ہے اور ایک فوجی چال کے ماتحت ایسا ہو رہا ہے۔ جرمن فوجیں اسٹالن گراڈ تک اسی طرح بڑھتی جائیں گی، لیکن پھر وہاں سے پسپا ہونی شروع ہوں گی تو سیدھی برلن میں ہی جا کر رُکیں گی اور وہاں ہٹلر اور اُس کی حکومت کی موت کی آخری رسم بھی ادا ہوجائے گی۔''

مولاناؒ نے یہ الفاظ اس زور اور جوش وخروش سے ارشاد فرمائے کہ ہم سب سُن کر چپ ہوگئے، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ مولانا کو واقعات وحقائق کے خلاف خواہ مخواہ اپنی رائے پر اصرار ہے اور اپنی رائے کے سامنے کسی کی کچھ سنتے ہی نہیں ہیں۔

بات آئی گئی ہوگئی، لیکن معلوم ہے کہ مولاناؒ کا یہ ارشاد جو کسی وحی یا الہام پر مبنی نہیں تھا، بلکہ جس کی بنیاد اُن کی عمیق قوتِ مشاہدہ اور گہری بصیرت پر قائم تھی، کس طرح حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ (4)

اگر مولاناؒ انگلینڈ یا امریکا میں ہوتے اور اُن کا یہ بیان وہاں کے اخبارات میں شائع ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے اُن کر مرتبہ (وزیرِاعظم برطانیہ اور مفکر) لائڈ جارج اور بونرلا (Anderew Bonar Law) سے اونچا تسلیم کرلیا جاتا۔

2۔ جنگ میں شرکت اور حکومتِ (برطانیہ) کی فوجی مدد

جنگِ (عظیم دوم) شروع ہوئی تو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں؛ کانگرس، مسلم لیگ اور جمعیت العلما نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں حکومت کی کوئی مدد نہ کی جائے اور نہ اس میں چندہ دیا جائے اور نہ فوج میں بھرتی کے لیے آدمی جائیں، لیکن مولانا (سندھیؒ) اس رائے کے سخت مخالف تھے اور وہ برملا اور بڑے زور کے ساتھ کہتے تھے کہ:

''یہ پالیسی بالکل غلط ہے۔ ہمیں اس جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنی چاہیے۔''

چناں چہ ہمارے فاضل اور عزیز ترین دوست (لیفٹیننٹ کرنل) خواجہ عبدالرشید صاحب — جو مولاناؒ سے بڑی عقیدت

www.rahimia.org

رکھتے تھے اور شاگرد بھی تھے —— ان کا بیان ہے کہ میں جنگ میں جانا نہیں چاہتا، لیکن مولانا نے مجھ کو مجبور کیا اور فرمایا کہ:

''میں تم کو حکم دیتا ہوں۔ اگر تم نے تعمیل نہیں کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔''(5)

دہلی میں ایک مرتبہ مولاناؒ سے ذکر آیا اور ہم نے پوچھا کہ:

''آپ آخر انگریزوں کی اس ظالم حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں؟''

تو (مولانا سندھیؒ نے) فرمایا:

''میں حکومتِ (برطانیہ) کا ہمدرد نہیں، بلکہ خود اپنے ملک کا ہمدرد ہوں۔ لو سنو! بات دراصل یہ ہے کہ اس جنگ کے بعد ہندوستان کا آزاد ہونا یقینی ہے۔ کیوں کہ اگر انگریز جیت بھی گئے، تب بھی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اور انٹرنیشنل معاملات کی وَجہ سے وہ اس درجے کمزور ہو جائیں گے کہ ہندوستان پر اپنی ملوکیت (حکمرانی) قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اور انھیں مجبور ہو کر ہمیں خود مختاری و آزادی دینی ہوگی۔ پس اگر یہ یقینی ہے تو ہمیں ابھی سے نیشنل فوج اور قومی سول ایڈمنسٹریشن کا انتظام کرنا اور ان کے لیے نوجوانوں کو تربیت دینا ہے۔ فوجی ٹریننگ کی صورت اس سے بڑھ کر اَور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اپنے نوجوان فوجی بھرتی کرائیں۔ فرض کرو اگر اس طرح ہم نے ایک لاکھ نوجوان فوج میں بھیجے اور اُن میں سے پچاس ہزار مر کھپ بھی گئے تو باقی جو پچاس ہزار بچیں گے، وہ تو آزاد ہند کی قومی فوج کے سپاہی ہوں گے، جن کے بل بوتے پر ہم حکومت چلا سکیں گے۔

اس کے برخلاف اگر ہم نے جنگ میں عدمِ تعاون کی منفی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ کل جب ہم کو آزادی ملے گی تو حکومت کی مشین چلانے کے لیے ہمیں انھیں زنگ آلودہ کل پُرزوں سے کام لینا ہوگا، جن سے آج انگریزی اقتدار کی مشین چل رہی ہے۔ اور اس کا جو کچھ انجام ہوگا، وہ یہ ہی ہوگا کہ عنوان بدل جائے گا، مگر معنون وہ ہی رہے گا۔ قالب مختلف ہوگا، مگر ایڈمنسٹریشن کی روح وہی رہے گی۔ اس بنا پر ضرورت ہے کہ چند ٹکوں کی خاطر فوج میں بھرتی ہونے والے ہندوستانی نہیں، بلکہ ملک کے سچے ہمدرد اور محبِّ وطن اور صحیح الخیال ہندو مسلمان نوجوان فوج میں بھرتی ہوں اور اس نیت اور جذبے سے ملٹری کی تعلیم حاصل کریں کہ اب انھیں جلد ہی قومی فوج کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کرنی ہوگی۔''

اس خیال اور رائے کے اظہار پر ہمارے ''مجاہدینِ آزادی'' نے مولاناؒ کو کیا کچھ نہیں کہا، ان کو ''ٹوڈی'' کہا۔ ''رجعت پسند'' بتایا۔ ''حکومت کا پٹھو'' کہا۔ یہاں تک کہ انھیں دنوں میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاس لاہور میں ہوا اور مولاناؒ وہیں شیرانوالا میں قیام پذیر تھے تو ان لوگوں نے مولاناؒ سے بات تک کرنی گوارا نہیں کی، لیکن ذرا سوچیے! کہ اگر کانگرس کی ریزولیوشن، جمعیت کے فتوے اور مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک سکھ نوجوان بھی فوج میں شریک ہو کر ملٹری ٹریننگ نہ لیتا تو آج ہماری جمہوری حکومت کیا 'کاٹھ کی پتلی' سے کچھ سوا ہوتی۔

3۔ ڈومینیئن سٹیٹس (آزادی زیرِ سایہ برطانیہ)

مولانا (سندھیؒ) شروع میں ہندوستان کی مکمل آزادی کے سب سے بڑے علم بردار تھے اور اس وقت تھے، جب کہ کانگرس

www.rahimia.org

کے شعورِ آزادی کے ناخن میں زندگی کے خون کی جھلک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی مشن پر کابل گئے اور دنیا جہان کی خاک چھانتے پھرے، لیکن روس، ٹرکی اور دوسرے ترقی یافتہ آزاد ملکوں کو دیکھنے کے بعد اُنھوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی رائے بدل لی اور بجائے مکمل آزادی کے ابتداءً ''آزادی زیرِ سایۂ برطانیہ'' کے قائل ہوگئے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ ہندوستان کا بچہ بچہ مکمل آزادی کے جذبے سے سرشار ہو رہا تھا اور کانگرس کا ہر کھدر پوش اور جمعیت و مسلم لیگ کا ہر کارکن سیاست دانی میں اپنے آپ کو چرچل و چیمبرلین سے کم نہیں جانتا تھا۔ اس بنا پر ظاہر ہے مولاناؒ کی اس رائے کو کیا درخور اعتنا سمجھا جاسکتا تھا۔

مگر مولاناؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ:

''(اس وقت) انگریز دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ قوم ہے اور اس کے مقابلے میں ہندوستانی انتہائی پس ماندہ ہیں۔ ان میں نہ تعلیم ہے اور نہ سیاسی شعور اور اس کی اہلیت ہے۔ اور نہ عوام میں شہری زندگی کے فرائض و واجبات کا احساس ہے۔ علاوہ بریں ہندو مسلم تعصّبات و اختلافات اور دوسرے اسباب کی بنا پر ہمارے قومی کیرکٹر میں چند در چند ایسی خرابیاں اور نقائص ہیں، جن پر ایک اجنبی حکومت کے قیام کی وَجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان حالات میں اگر ہم نے مکمل آزادی حاصل کی تو یک بہ یک ہمارے کاندھوں پر ایک ایسا بھاری بوجھ آ پڑے گا، جس کو ہمارے کاندھے اٹھا نہ سکیں گے اور اس سے ملک کی سماجی حالت ابتر ہوجائے گی۔''

مولاناؒ کو کانگرس سے اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ:

''اُس نے اپنی کوششوں کو صرف انگریزوں کے یہاں سے نکال دینے پر مرکوز رکھا ہے اور اس کے علاوہ ملک کی تعمیر کے اہم کام اس نے پس پشت ڈال رکھے ہیں۔''

مولاناؒ فرماتے تھے کہ:

''آزادی کے بعد یہاں جمہوریت یا عوامی حکومت قائم ہوگی، لیکن جس ملک کے عوام شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس نہ رکھتے ہوں، وہاں جمہوریت سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ اور اس کی وَجہ سے ملک میں بسا اوقات اختلاف و خلفشار پیدا ہوسکتا ہے۔''

اس بنا پر مولاناؒ کی رائے تھی کہ:

''ہم کو شروع میں آزادی زیرِ سایۂ برطانیہ لینی چاہیے، تاکہ اس مدت میں ہم اپنے عوام کو تعلیم یافتہ کردیں۔ ملک کو صنعتی و حرفتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنا دیں۔ یہاں کی اقتصادی حالت قابلِ اطمینان ہوجائے اور ملک کے ذرائع پیداوار کا صحیح استعمال کرنا ہم سیکھ جائیں اور (ہندوؤں کی مقدس) گائے اور (مسجد کے سامنے بجنے والے) باجے پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنا بھول جائیں تو پھر اس وقت بے شک ہم کو مکمل آزادی لینی چاہیے اور ہم اس آزادی کے بہ ہمہ وجوہ محافظ اور نگراں ہوسکیں گے۔''

مولاناؒ کا یہ خیال صحیح تھا یا غلط؟ اور اگر صحیح تھا تو کس حد تک؟ واقعات کی روشنی میں آپ خود سوچیے اور غور کیجیے۔ (6)

4۔ تقسیمِ ہند (سے متعلق مولانا سندھیؒ کی رائے)

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مولاناؒ کٹر کانگرسی تھے اور سب سے پہلے مسلمان تھے، جنھوں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ ہدایت افغانستان میں کانگرس کی ایک شاخ (کانگرس کمیٹی کابل) قائم کی اور وہاں کی پبلک تک اس جماعت کی آواز پہنچائی۔ وہ متحدہ قومیت کے بھی قائل تھے اور ہندوستان کی وحدت کے معترف بھی تھے، لیکن جب1939ء میں ہندوستان آئے اور یہاں کی سیاست کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ہندو مسلم عوام کے جذبات اور رُجحانات کو دیکھا، ان کے دلوں کو ٹٹولا اور پرکھا تو وہ تقسیم کے قائل ہوگئے، لیکن اس لیے نہیں کہ تقسیم فی نفسہٖ (از خود) کوئی اچھی یا ضروری چیز تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات اور اُن کی باہمی نفرت وعداوت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولاناؒ کے نزدیک اب اس سے انحراف کرنا ایک اَور بڑے فتنے کو دعوت دینا تھا، لیکن اس میں مولاناؒ اس ترمیم کو ضروری قرار دیتے تھے کہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان میں ہندو کو اور ہندوستان میں مسلمان کو اپنے ملک کے شہری اور شریکِ حکومت کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہوجائے گا۔ اور اس سے جو عظیم بربادی آئے گی، ایک مدتِ دراز تک اس کی تلافی نہ ہوسکے گی۔ معاشرہ درہم برہم ہوجائے گا۔ اس ملک کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پانی پھر جائے گا، بلکہ مولاناؒ کی رائے تھی کہ:

''تقسیم علاقائی کلچر کی بنیاد پر ہونی چاہیے، جو ہندو اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے۔''

اس سلسلے میں آپؒ کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ:

> ''شمالی ہندوستان کا کلچر ہندو مسلمانوں دونوں کا ایک ہے، یعنی ایک ہی لباس، ایک ہی زبان، ایک ہی اندازِ معاشرت، لیکن اُس میں مسلمانوں کا کلچر غالب ہے۔ اسی طرح جنوبی اور مشرقی ہندوستان کا کلچر ہے، جو اگرچہ دونوں فرقوں کا مشترک کلچر ہے، لیکن ہندو تہذیب کے عناصر اس میں غالب ہیں۔''

مولاناؒ کا خیال یہ تھا کہ:

> ''اگر اس طرح تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان پورا ہوجاتا ہے اور پھر آپس میں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی نہیں پیدا ہوتی۔''

اپنے اس مخصوص نظریے کے ماتحت مرحوم کانگرس کے بھی مداح تھے اور لیگ کے بھی اور ساتھ ہی دونوں کے مخالف بھی۔ کانگرس کے اس لیے کہ وہ تقسیم منظور نہیں کرتی اور لیگ کے اس لیے کہ وہ تقسیم بر بنائے مذہب کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس بنا پر کلچرل اشتراک و مجانست کو بنیاد قرار دے کر آپ نے ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی'' کے نام سے بنائی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ اس پارٹی کے ذریعے کانگرس اور لیگ دونوں سے لڑیں۔ (7)

ہائے افسوس! کہ ابھی اس ملک کے آسمان پر آزادی کا سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولاناؒ اپنے مولیٰ کو پیارے ہوگئے۔ ورنہ آج وہ زندہ ہوتے تو کانگرس، لیگ اور جمعیت تینوں کو مخاطب کرکے فرماتے کہ:

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (8) (تو ہی بس (کافی) ہے آج کے دن اپنا حساب لینے والا)

اور ہم کو یقین ہے کہ کسی کے پاس ان کی بات کا جواب نہ ہوتا۔[9]

5۔مغربی نیشنل اِزم

اس سلسلے میں ایک اور بات جو مولاناؒ فرمایا کرتے تھے اور جس کو انھوں نے لکھا بھی ہے اور جس کو سُن کر ملک کے عوام و خواص ان کو بُرا بھلا کہتے تھے، وہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان کے لیے یہ ضروری تھا کہ:

''وہ ٹرکی کی طرح اپنی معاشرت کے پُرانے چولے کو اُتار کر رکھ دے اور مغربی کلچر، جس سے وہاں کی قومیت کا خمیر تیار ہوا ہے، اسے اختیار کر لے۔''

اس بارے میں آپ کا خیال تھا کہ:

''کلچر خواہ کہیں کا اور کسی ملک کا ہو، وہ بہرحال کسی کی میراث اور جائیداد نہیں ہوتا۔ اس کی ایجاد کسی نے کی ہو، لیکن اگر اس میں کچھ خوبیاں ہیں اور وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق ہے تو دنیا کی ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے اختیار کر لے اور اپنائے۔ اور ایسا کرنے سے کسی قوم کی قومیت فنا نہیں ہوتی، بلکہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑی ہو کر اجنبی اور بے میل نظر نہیں آتی۔ چناں چہ آج ایرانی، مصری، شامی، عراقی، چینی اور ترکی ہر جگہ کے لوگ کوٹ پتلون پہنتے ہیں، لیکن پھر بھی ایرانی اور مصری وغیرہ ہی رہتے ہیں، کچھ اَور نہیں ہو جاتے۔''

علاوہ بریں آپؒ فرماتے تھے کہ:

''اٹھارہویں صدی سے قبل یورپ میں ہندوستان کی طرح ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے جاتے تھے، لیکن جب وہاں صنعت و حرفت کی ترقی کا دور شروع ہوا تو اس کی مناسبت سے زیادہ چست اور مستعد لباس پہنا جانے لگا، جو آج ہر جگہ رائج ہے۔ پس اگر ہندوستان کو بھی صنعتی ملک بننا ہے اور لازمی طور پر بننا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی پُرانی وضع کے ڈھیلے ڈھالے لباس کو خیرباد کہے اور یورپ کا لباس پہنے۔''

حضرت مرحوم اَور بھی بہت کچھ فرماتے تھے اور اس ذیل میں ڈاڑھی اور پردہ وغیرہ کے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے، جو سوچنے والے دماغ کے لیے کچھ کم اہم نہیں ہیں، لیکن اس مختصر مقالے میں نہ ان کے بیان کرنے کی گنجائش ہے اور نہ مناسب ہے۔ البتہ اپنی کتاب میں ان سب چیزوں پر نہایت مفصل گفتگو کروں گا۔ البتہ موقع کی مناسبت سے اس سلسلے میں مولاناؒ جو ایک اہم نکتہ بیان کرتے تھے، اس کا ذکر ضروری ہے۔ فرماتے تھے کہ:

''مغربی نیشنل اِزم کا اختیار کرنا' خاص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اَور بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہندو مسلمانوں کے تہذیبی تعصّبات مٹ جائیں گے اور دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں نہیں ہوں گے۔ ورنہ اگر ایسا نہیں ہوا تو آزادی کے بعد دونوں فرقوں میں تہذیبی جنگ شروع ہو جائے گی۔ اور چوں کہ مسلمان اقلیت میں ہیں، اس لیے ان کو شکست ماننی پڑے گی۔ ہندو کہیں گے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب اور کلچر اختیار کرنا چاہیے، اسی وقت وہ صحیح معنی میں ہندوستانی ہو سکتے ہیں۔ مسلمان کچھ اس کی مخالفت کریں گے، لیکن آخر انھیں شکست ہو گی اور پھر وہ ہندو کلچر

www.rahimia.org

اور تہذیب کو اختیار کرکے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوجائیں گے، جس سے ان کی خودی فنا ہوجائے گی۔ اس لیے دھوتی پاجامہ، چپل اور جوتہ، کرتہ اور شیروانی کے نزاع کو حل کرنے کی بہتر صورت یہ ہی ہے کہ دونوں کو ہی خیرباد کہہ دیا جائے اور ٹرکی کی طرح اپنا قومی لباس بھی مغربی بنالیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلمان معاشرت اور لباس کے اعتبار سے ایک ہوں گے اور متحدہ قومیت کی وَجہ سے انھیں ایک ہونا بھی چاہیے۔ اور اس کے باوجود ان کو یہ خیال نہیں ستائے گا کہ ہندوؤں نے تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کو فتح کرلیا اور اس پر اپنے کلچرل اقتدار کی گرفت کو سخت کردیا ہے۔''

مولاناؒ کا خیال تھا کہ:

''مسلمان اسلامی معاشرت کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے مغربی کلچر کو بہ آسانی کسی قدر تراش خراش کے ساتھ اختیار کرسکتے ہیں۔''

6۔ رومن کیرکٹر (رسم الخط کے بارے میں مولاناؒ کی رائے)

ان کا یہی خیال زبان کے رسم الخط کی نسبت تھا۔ فرماتے تھے کہ:

''ہندو مسلمان کا جھگڑا بولی پر ہرگز نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں، لیکن اصل نزاع رسم الخط کا ہے۔ مسلمان ہندوستانی کو فارسی رسم الخط میں لکھنا چاہتے ہیں اور ہندو دیوناگری میں۔ اس لیے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آزادی ملنے سے قبل ہی رومن رسم الخط کو رواج دیا جائے۔ ورنہ آزاد ہونے کے بعد اکثریت کی طاقت کے گھمنڈ میں ہندو رومن کیرکٹر کو بھی قبول نہیں کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ اُردو رہے گی اور نہ اس کا رسم الخط۔''

اب آپ مولاناؒ کے ان ارشادات پر غور کیجیے اور جو کچھ ہورہا ہے، اُس کی روشنی میں سوچیے کہ آج یہ باتیں کس طرح حرف بہ حرف الہامی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود مولاناؒ کے ساتھ اپنوں نے اور پرایوں نے جو معاملہ کیا، ہمیں اس پر ذرا حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ جس ملک میں سیاسی لیڈرشپ کے لیے سب سے بڑی سند ''جیل جانا'' ہو اور جہاں پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر گلا پھاڑنا' حریت کوشی و تدبرِ سیاسی کا سب سے بڑا ثبوت ہو، وہاں مولاناؒ ایسے حقائق آگاہ وحق شناس مفکر کے لیے اور توقع ہی کس برتاؤ کی ہوسکتی تھی۔

حواشی

1۔ حضرت مولانا اکبرآبادیؒ چاہتے تھے کہ وہ حضرت مولانا سندھیؒ پر ایک مفصل اور ضخیم کتاب قلم بند کریں۔ راقم سطور کو انتقال سے چند ماہ قبل اُن سے اُن کی صاحبزادی کے مکان واقع لالہ زار کالونی، نزد کے پی ٹی، کراچی پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت بھی انھوں نے اس کتاب کی بابت اظہارِ خیال کیا تھا کہ کاش یہ کتاب لکھی گئی ہوتی تو مولانا سندھیؒ کے علوم و افکار کی حقیقی نوعیت واضح ہوجاتی، لیکن قدرت نے موقع نہیں دیا۔ اس ملاقات کے چند ماہ بعد ہی کراچی میں ۴/رمضان ۱۴۰۵ھ/ 24/مئی 1985ء کو مولانا اکبرآبادیؒ کا وصال ہوگیا۔ نہیں معلوم کی اُن کی اس تصنیف کا مسودہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ (آزاد)

2۔ مولانا رحیم شاہ دہلویؒ اپنے مقالے 'انقلابی مولوی' میں لکھتے ہیں: ''(مولانا عبیداللہ سندھیؒ) 5/اپریل (1939ء) کی شام کو سوا پانچ بجے دہلی

www.rahimia.org

پہنچے۔ اسٹیشن پر جمعیت العلما، مجلس احرار اور ہر فرقے اور ہر خیال کے لوگوں نے آپ کا شان دار خیر مقدم کیا اور پھولوں کی بارش میں آپ کو موٹر تک پہنچایا۔ دہلی میں آپ کی مہمان داری کا شرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کو حاصل ہوا۔'' (انقلابی مولوی، از مولانا محمد رحیم شاہ دہلویؒ، طبع: مکتبہ ادب، اردو بازار، دہلی، فروری 1947ء)

3۔ ''یکم ستمبر 1939ء کو جب ہٹلر نے پولینڈ کے شہر وارسا کی اینٹ سے اینٹ بجا کر عالمی جنگ کی ابتدا کی تو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ 1939ء سے لے کر 1941ء تک یعنی روس پر حملے سے قبل جرمنی یورپ اور وسطی یورپ کا مالک بن چکا تھا۔ ... ہٹلر نے جب 22/ جون 1939ء کو صبح ساڑھے تین بجے آپریشن بار باروسا Operation Barbarossa کے نام سے روس پر حملہ کیا اور جرمن فوجیں روس میں داخل ہوئیں تو مغربی بورژوا سیاست دان اور فوجی ماہرین کا خیال تھا کہ صرف چھ ہفتے میں جرمنی کی فوجیں سوویت یونین پر قابض ہو جائیں گی۔ اس قیاس آرائی کی وجہ پولینڈ اور فرانس کے حالات تھے، جہاں پر صرف دو ہفتے میں جرمن افواج نے اپنا قبضہ جمایا تھا اور برطانوی افواج کو بھی براعظم یورپ سے مئی 1940ء میں بے دخل کر دیا۔'' (باہر جنگل اندر آگ، پاکستان کی سیاسی کش مکش کا سفر، از علی جعفر زیدی، ص 533 و 535، طبع: ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور 2014ء)

4۔ ''ہٹلر نے سوویت یونین کے خلاف اپنی جنگ کا آغاز اس منصوبے سے کیا تھا کہ فوج کا بڑا حصہ ماسکو پر حملہ کرے گا اور فوج کے دو چھوٹے حصے لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ پر حملہ کریں گے۔ ماسکو کو چند ہفتوں میں فتح کر کے یہ بڑی فوج لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ پہنچ کر ان شہروں پر قبضہ کر لے گی اور ان تین شہروں پر قبضہ ہونے کے بعد پورا ملک جرمن فوج کے سامنے ہتھیار پھینک کر اپنی شکست کو تسلیم کر لے گا۔ ہٹلر کے خیال میں روسی فوج ایک ایسی بے کار فوج تھی، جس کے پاس نہ تو جدید اسلحہ تھا اور نہ ہی جنگی تربیت۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ عوام نہتے بھی ہوں اور وطن کو بچانا چاہیں تو بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں۔ ہٹلر نے 30 لاکھ فوجی، تین ہزار پانچ سو اسّی ٹینک، سات ہزار ایک سو اکاسی آرٹلری توپیں، ایک ہزار آٹھ سو تیس جنگی جہاز اور سات لاکھ پچاس ہزار گھوڑے اور خچر روس کے محاذ میں جھونک دیے۔

30/ ستمبر 1941ء کو ماسکو پر حملہ کیا گیا۔ ہٹلر کو ہر اعتبار سے برتری حاصل تھی۔ جرمن افواج شہر پر شہر فتح کرتی گئیں اور دو ہفتوں میں انھوں نے چھ لاکھ اٹھاسی ہزار روسی فوجی قیدی بنا لیے۔ 28/ نومبر 1941ء تک جرمن افواج ماسکو کے نزدیک دریا دولگا کو عبور کر چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ماسکو پر چند ہی روز میں جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا کہ 5/ دسمبر کو جرمنی کی پیش قدمی روک دی گئی۔ روسی افواج نے جرمن افواج کو پسپا کر کے اپنے علاقے اور فوجی رہا کروانا شروع کیے۔ جنوری 1942ء تک انھوں نے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے اور جرمن افواج سردی کے شدید موسم میں بُری طرح پھنس گئیں۔ دسمبر میں درجہ حرارت منفی چالیس سے بھی نیچے چلا گیا۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی ماسکو پر قبضہ ہو جائے گا۔ موسم کی اس شدت کے لیے ہٹلر کی فوج تیار نہیں تھی اور نہ ہی جرمن فوج اس طرح کے موسم سے مانوس تھی۔ جرمن فوجی سردی کی شدت سے ٹھٹھر کر مرنے لگے۔ ٹینکوں میں ڈیزل جم گیا۔ خوراک اور سامانِ جنگ کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔'' (ایضاً، ص 37-536)

5۔ خواجہ عبدالرشید مرحوم نے اپنے ایک مضمون ''حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی چند تعلیمات'' میں اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''1940ء کا شروع تھا کہ جب حضرت الاستاذ مولانا سندھیؒ سے میری ملاقات مولوی احمد علی (لاہوری) شیرانوالا (گیٹ لاہور) کے توسط سے ہوئی۔ میں ان کی مسجد میں گاہے بہ گاہے درس کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک روز انھوں نے فرمایا کہ مجھے چند ایک نوجوان درکار ہیں، جن کو میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فلسفے کی تعلیم دوں۔ خوش قسمتی سے اُن کی نگاہِ التفات مجھ پر بھی پڑی اور مجھے انھوں نے تعلیم کے لیے منتخب کر لیا۔ ... جنوری 1941ء میں مولانا (سندھی) نے یک لخت مجھے حکم دیا کہ: ''میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔'' میں نے کچھ تردّد کیا۔ اس وقت میں ڈاکٹری کے امتحان سے فارغ ہو چکا تھا، مگر (فوجی) بھرتی کی طرف رجوع نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ والد صاحب مرحوم بھی اکثر اصرار کرتے رہتے تھے۔ مولانا سندھیؒ نے فرمایا: ''ہم لوگ بڑے بے وقوف ہیں، جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے اور یہ مولوی جو بھرتی کے خلاف فتوے دیتے ہیں، ان سے بڑھ کر احمق کوئی نہیں ہے۔'' فرمایا: ''جاؤ اور جنگ کا تجربہ حاصل کرو۔''

میں نے عرض کیا کہ: ''مولانا! مجھے تو ابھی آپ سے بہت کچھ سیکھنے کی توقع تھی۔'' فرمایا: ''نہیں! تم چلے جاؤ! سب کچھ خود آ جائے گا۔'' مجھے بڑا

تعجب ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ...اسی شش و پنج میں تھا کہ استاذِ مرحوم کا حکم یاد آیا۔ انسپکٹر جنرل کے پاس گیا، (فوجی بھرتی کے لیے) فارم پُر کیا اور اُسی روز ڈاکٹری (میڈیکل ٹیسٹ) کے لیے چھاؤنی چلا گیا۔ یہ کام ایک ہی روز میں تمام ہوا۔ واپسی پر چھاؤنی سے انسپکٹر جنرل سے حکم ملا کہ یکم/فروری (1941ء) کو راولپنڈی حاضر ہوجاؤ۔ دوسرے روز علی الصبح حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مسکرا دیے۔ فرمایا کہ: ''ہمارے کہنے پر تو تم جاتے نہ تھے، اب تمھیں مجبوراً جانا ہوگا'' بھرتی کے بعد اسی سال کے وسط میں مجھے سمندر پار بھیج دیا گیا۔

آپ باور کیجیے کہ میں نے ایک ایک کرکے لاہور سے شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کی کتابوں کے تراجم بمع متن کے منگوائے اور پڑھ دیے۔ عربی زبان کا بھی ابتدائی امتحان بغداد ہی میں دیا اور پاس کرلیا۔ اور کئی مستند کتابیں منگوا کر پڑھ ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں سمندر پار پہنچا تو مجھے اُردو میں خط لکھنے میں ہچکچاہٹ تھی، مگر جب دو برس بعد بندہ مکان لوٹا تو ''برہان'' کے لیے مضامین لکھنے شروع کردیے۔ پہلا مضمون مولانا سندھیؒ ہی سے متعلق تھا۔'' (مضمون طبع شدہ ہفت روزہ قندیل لاہور، 19/اگست تا 2/ستمبر 1956ء، بہ حوالہ افکار وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مرتب: ثناء اللہ سومرو، ص 95-194، طبع: اسلامیکا فاؤنڈیشن، کراچی)

6۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی یہ رائے کس قدر صائب تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ 1947ء میں آزادی حاصل کرلینے کے بعد ہندو مسلم فسادات اور ہندوستان میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتِ حال بگڑنے کے نتیجے میں کانگرس کے لیڈر جواہر لال نہرو نے 15/اگست کو ہندوستان کے وزیراعظم کا حلف اٹھانے کے صرف اکیس دن بعد ہندوستان کے سابقہ وائسرائے اور موجودہ گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لاء اینڈ آرڈر قائم کرنے کے اختیارات سونپے اور امن وامان قائم کرنے اور نظم ونسق کو درست کرنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر ہندوستان کا وزیرداخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی موجود تھا۔ اس حقیقت کی نشان دہی ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ''(Freedom at Midnight) کے مصنّفین نے کچھ اس طرح سے کی ہے: ''6/ستمبر 1947ء سنیچر کا دن تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کی مطالعہ گاہ میں صرف تین افراد موجود تھے۔ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل، دونوں ہندوستانی لیڈر بہت پریشان اور سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ ..پنجاب قابو سے باہر ہوچکا تھا۔ شرنارتھی اتنی تیزی سے آرہے تھے کہ جس کا کسی کو خواب وخیال میں بھی اندازہ نہیں تھا۔ اب دہلی میں بھی تشدد کے واقعات شروع ہوچکے تھے۔ نہرو نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا: ''ہم سب کو ایک ساتھ قابو میں کیسے لائیں؟ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔'' ''لیکن قابو میں تو لانا ہی ہوگا نا!'' ماؤنٹ بیٹن نے واضح کیا۔ ''بے شک لانا ہوگا، مگر کیسے؟'' نہرو نے جواب دیا۔ ''ہمیں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ زندگی کا بیش تر حصہ ہم نے برطانوی جیلوں میں گزارا ہے۔ ہمیں ستیہ گرہ (احتجاج) کرنے کا تجربہ ہے، حکومت کرنے کا نہیں۔ اگر ہمیں کوئی منظّم حکومت عام حالات میں سونپی جائے تو ہم چلا لے جائیں گے، لیکن یکا یک جو صورتِ حال ہماری آنکھوں کے سامنے آئی ہے، وہ مکمل لاقانونیت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔''

اس کے بعد نہرو نے جو درخواست کی، وہ کسی ہندوستانی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ جس آدمی نے آزادی کی جدوجہد کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، وہ ایک ایسی پیش کش کے لیے کیسے آمادہ ہوگیا؟ ...نہرو نے کہا: ''میں اپنے ذاتی وقار کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دوں گا کہ ملک کے تقاضے اس کی خاطر قربان ہوجائیں۔ جنگِ عظیم (دوم) کے دوران آپ (جاپان میں اتحادی فوج کے) اعلیٰ ترین کمانڈر رہ چکے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ جیلوں میں تھے۔ آپ بہترین منتظم ثابت ہوچکے ہیں۔ جنگ میں آپ نے لاکھوں پر حکم چلائے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت نے ہمیں جس تجربے سے محروم رکھا، وہ آپ کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے۔ اتنے بڑے ملک کو اتنے پیچیدہ مسئلوں کے ساتھ یکا یک ہمارے کندھوں پر ڈال کر آپ اپنے کندھے ہٹا نہیں سکتے۔ ہم اس وقت ہنگامی حالات سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے؟''۔ ''جی ہاں!'' پٹیل نے تائید کی۔ ''آپ کو یہ رہنمائی قبول کرنا ہوگی۔ نہرو نے بالکل مناسب تجویز رکھی ہے۔'' ماؤنٹ بیٹن کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ''مائی گاڈ! ابھی ابھی ملک مَیں نے آپ لوگوں کو سونپا ہے۔ وہی ملک مجھے آپ واپس پکڑانا چاہتے ہیں۔'' نہرو نے کہا: ''آپ حالات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے! ملک آپ ہی کو سنبھالنا ہوگا۔ ہم دونوں وہی کریں گے، جو آپ چاہیں گے۔'' ماؤنٹ بیٹن کو ان کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے کہا: ''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ ملک کی باگ ڈور آپ نے میرے ہاتھ میں دے دی ہے تو آپ کی سیاسی حیثیت ختم ہوجائے گی۔ اوّل تو ہندوستانیوں

www.rahimia.org

نے اپنے وائسرائے کو گورنر جنرل بنا کر رکھ دیا اور اب ملک اس کو سونپ رہے ہیں۔ ناممکن!'' نہرو نے کہا: ''ہمیں ناممکن کو ممکن بنانا ہوگا۔ اگر آپ نے انکار کر دیا تو ملک ہم سے نہیں سنبھلے گا۔ رہی بات دوسروں کو اس بات کی بھنک ملنے کی تو ہمیں کوئی ایسا طریقہ تلاش کرنا ہوگا، جس سے یہ راز پردے میں رہے۔'' (فریڈم ایٹ مڈنائٹ، مصنف: لیری کولنس، ڈامنک لیپئر، ترجمہ: سعید سہروردی، ص99-198، طبع: نگارشات پبلشرز، لاہور)

7۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے 10/دسمبر 1939ء کو ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی'' کا اساسی پروگرام شائع کیا تھا۔ اس کی تمہید میں مولانا سندھیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''جس مبصر کو گزشتہ تیس برس کی (ہندوستان کی) تاریخ پیشِ نظر ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تقدُّم (پیش قدمی) اتنا مشکل نہیں جتنا اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا، لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعثِ نقصان نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے، مگر عملاً ؎

مرض بڑھتا گیا ، جوں جوں دوا کی

کا منظر سامنے نظر آتا ہے۔ ہم نے عملی اشتراک کے ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔ اس طرح ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے ایک ایسا قطعہ کا انتخاب کیا ہے، جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔ جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے، اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے، جو ان کی تالیفِ قلوب پر قادر ہو سکتا ہے تو اس لا ینحل مشکل کی کلید (غیر حل شدہ سماجی مشکل کے حل کی چابی) مل جائے گی۔'' (خطبات و مقالات مولانا عبیداللہ سندھیؒ، ص293، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

8۔ القرآن 17:14۔

9۔ مسلم لیگ اور جمعیت علمائے اسلام کے علما اور رہنماؤں کی مایوسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے ایک اہم رہنما حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ریڈیو پاکستان سے نشر کی گئی اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' کے مقدمے کے شروع میں اپنی مختصر سرگزشت بیان کرتے ہوئے صفر ۱۳۸۳ھ/ جون 1963ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''یکم/مئی 1948ء کو میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا، جس میں وطن مالوف مرکزِ علوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور اُن کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رُخ کیا۔ والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر اور جس طرف جا رہا ہوں، وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گزارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اُس میں دینی رُجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کُن امیدوں کے ملے جلے تصورات میں غلطاں و پیچاں دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے 6/مئی 1948ء کو اللہ تعالیٰ نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا۔

یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں۔ اس پندرہ سال میں کیا کیا، اور کیا دیکھا، اس کی سرگزشت بہت طویل ہے۔ یہ مقام اُس کے لکھنے کا نہیں۔ جن مقاصد کے لیے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لیے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی ؎

بلبل ہمہ تن خون شد ، و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے! اگر ایں است بہارے
(بلبل کا پورا جسم خون سے رنگین ہو چکا اور پھول کا پورا جسم بھی چاک ہو چکا۔
اگر یہی ہے بہار تو اس بہار پر ہائے افسوس!)

حکومت کے راستے سے کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں۔'' (معارف القرآن، جلد اوّل، از مفتی محمد شفیع دیوبندی، ص63-62، ناشر ادارۃ المعارف کراچی، طبع نومبر 1980ء)

☆

ولی اللّٰھی افکار؛ عصری اھمیت

اسلام اور عدلِ اجتماعی

(ولی اللّٰہی تعلیمات کی روشنی میں بنیادی تصورات)

خطاب حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(دو سال قبل ملک کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کو شعبۂ اسلامیات میں لیکچر کی دعوت دی۔ چناں چہ انھوں نے مؤرخہ 3/نومبر 2016ء کو شعبہ علومِ اسلامیہ کے سیمینار ہال میں ''اسلام اور عدلِ اجتماعی'' کے عنوان پر ایک لیکچر دیا تھا۔ لیکچر سے پہلے ڈاکٹر مفتی سعیدالرحمٰن مسئول موسیٰ پاک چیئر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی نے موضوع کی اہمیت اور مقرر کے تعارف پر گفتگو کی۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی اور آخر میں صدرِ مجلس ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے اس لیکچر پر اپنے وقیع تأثرات کا اظہار بھی کیا۔

چوں کہ لیکچر میں اسلام کے عدلِ اجتماعی کے حوالے سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار و تعلیمات کی روشنی میں سماجی تشکیلِ نو پر گفتگو کی گئی تھی، اس لیے لیکچر کے بعد صدرِ مجلس اور صدر شعبۂ اسلامیات نے حضرت آزاد رائے پوری کو یونیورسٹی میں ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر خطبات کی ایک لیکچر سیریز کی بھی دعوت دی۔

اس موقع پر حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے اُن کی اس دعوت کو شکریے کے ساتھ قبول کیا اور پھر اپریل 2017ء میں مذکورہ عنوان پر درجِ ذیل موضوعات پر چار لیکچرز شعبۂ اسلامیات کے اساتذہ اور طلبا کے سامنے پیش کیے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف　　2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین

3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت　　4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات

اس طرح اسلام اور عدلِ اجتماعی کے حوالے سے ولی اللّٰہی تصورات پر ایک جامع لیکچر سیریز اہلِ علم وفکر کے سامنے آئی۔ ان لیکچرز کی اہمیت کے سبب انھیں آڈیو ریکارڈنگ سے تحریری صورت میں قلم بند کیا گیا ہے اور حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کی نظرِ ثانی، ذیلی عنوانات اور حوالہ جات کی تخریج کے بعد یہ علمی سرمایہ قارئینِ ''شعور و آگہی'' کے لیے پیش کیا جائے گا۔ چناں چہ اس شمارے میں پہلا لیکچر ''اسلام اور عدلِ اجتماعی'' ترتیب و تدوین کے بعد قارئین کے لیے آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار کے حوالے سے دیے گئے دیگر لیکچرز بھی اسی طرح ترتیب و تدوین کے بعد ''شعور و آگہی'' کے آئندہ شماروں میں شائع کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان لیکچرز سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! مدیر)

www.rahimia.org

خطبہ مسنونہ

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم. اما بعد!

فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرحیم. قال اللہ تبارک و تعالیٰ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (1)

و قال تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (2)

و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم: ''کانت بنو اسرائیل تسوسھم الأنبیاء، کلما ھلک نبی، خلفہٗ نبیّ آخر. ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون خلفاء، فیکثرون.'' (3)

و قال النّبیّ ﷺ ''لا تزال طائفة من امّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّھم من خالفھم.'' (4)

صدق اللّٰہ مولانا العظیم، و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

کلماتِ تشکر

صاحبِ صدر، معزز اساتذۂ کرام، معزز طلبائے عظام!

سب سے پہلے تو میں شعبۂ اسلامیات کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کروں گا کہ ہمیں ایک موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ دین اسلام کی تعلیمات کا فہم و شعور اور اس حوالے سے علمی، فکری اور عملی بنیادوں کو سمجھنا، آج ہمارے طلبا، دانش ور اور سوسائٹی کے سنجیدہ طبقات کا بنیادی تقاضا ہے۔ جو ملک اسلام کے نام پر لیا گیا ہے، اس میں اسلام کی اجتماعی تعلیمات کا سوسائٹی پر کیا اثر ہے۔ سوسائٹی کی تشکیل دین اسلام کے نقطہ نظر سے کیسے ممکن ہے، ان اُمور پر غور و فکر کرنا، رہنمائی حاصل کرنا، بنیادی اہداف و مقاصد طے کرنا، عملی جدوجہد کرنا، نہ صرف ہمارا دینی تقاضا ہے، بلکہ قومی اور ملکی تقاضا بھی ہے۔ سوسائٹی کی ذمہ داری بھی ہے۔

دینی حوالے سے سوسائٹی کے اجتماعی مسائل پر غور و فکر کی اہمیت

دنیا کے دیگر دو نظام ہائے حیات، سرمایہ داری اور سوشلزم سے قطع نظر انبیا علیہم السلام کی تعلیمات، بالخصوص امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی روشنی میں ہمیں اپنی سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کے حل کرنے کی فکر کرنا، اس پر غور و فکر کرکے ایک متبادل نظام کے طور پر پیش کرنا آج ہماری بنیادی ضرورت ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج مادیت پرست نظام ہائے حیات ہمارے طلبا اور نوجوان نسل کو یہ باور کراتے ہیں کہ 'دنیا میں انسانیت نے مذہب چھوڑ کر ترقی کی ہے۔ یہ ترقی خدا کا انکار کرکے، مادیت پرستی قبول کرنے اور مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے سے حاصل ہوئی ہے'۔

اسلام کے معاشی نظام کے مطالعے کی اہمیت

سوشلزم ہو یا سرمایہ داری، دونوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ معاشروں کی تشکیل کی اساس مذہب نہیں ہے۔ مذہب کو چھوڑ کر کسی مادی فلسفے پر، خواہ ایڈم سمتھ کا دیا ہوا کیپٹل اِزم ہو یا اُس کے ردِعمل میں کارل مارکس نے جو سوشلزم یا کیمونزم پیش کیا،

www.rahimia.org

اُس کے تناظر میں ہی سوسائٹی تشکیل دی جاسکتی ہے۔ اس چیلنج کی سنگینی اس حوالے سے مزید بڑھ جاتی ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد اوراسی طریقے سے ڈیجیٹل ایج (Digital Age) کے آنے کے بعد یہ سوال اب مسلم دنیا کے سامنے یقینی طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ اس دور کے ان جدید وسائلِ پیداوار اور احتیاجات اور ضرورتوں کے تناظر میں دین اسلام کی بنیادی اقدار، اصول وضابطے اور عملی نظام کیا ہے؟ سرمایہ داری نے سرمائے (Capital) کی اساس پر صنعتی دور کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک سسٹم دیا ہے۔ سوشلزم نے انسانی محنت کی اساس پر اپنے تصورات کے تحت ایک طریقۂ کار اور عملی نظام مرتب کیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے بالخصوص وہ ستاون مسلم ممالک — جو اسلام کے نام پر قائم ہیں اور مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ہیں — اس حوالے سے ان کے سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی نظام اس چیلنج کا جواب کس طور پر دیتے ہیں۔ عملی صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے ان مسلم ممالک میں جو معاشی نظام موجود ہے، وہ سرمایہ داری ہے۔ یا کچھ ملکوں نے کچھ عرصے کے لیے سوشلزم سے متأثر ہوکر چند اقدامات کیے ہیں۔ اس تناظر میں سوال اُبھرتا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا معاشی نظام کیا ہے؟

اسلام کے سیاسی نظام کے مطالعے کی اہمیت

یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ اگر مسلم معاشروں کا جائزہ لیا جائے تو سیاسی سسٹم بھی سرمایہ دارانہ اصول پر یا سوشلزم کی اساس پر ہیں۔ اس حوالے سے سیاسی سسٹم قائم کرنے کے لیے دین کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟ مذہب' حکومت اور سیاست کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور دین نے اس مسئلے کے حل کے لیے کیا کردار متعین کیا ہے؟ سماجی شیرازہ بندی پر مشتمل عمرانی مسائل ہوں، معاشرتی مسائل حل کرنے کے لیے سوشیالوجی سے متعلق مسائل ہوں، اسلام کے بنیادی اساسی اصول اور ضابطے کیا ہیں کہ جس کی اساس پر انسانی معاشروں کی تشکیل کی جائے۔

اجتماعی مسائل کے حل کے لیے دورِ حاضر کا چیلنج

یورپ کو محض بُرا بھلا کہنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ محض یہ کہنے سے کہ اُن کا سیاسی نظام بُرا ہے، معاشی نظام بُرا ہے۔ آج کے علمی، فکری اور نظریاتی دور میں جب کہ نظریات کی جنگ اور نظام ہائے حیات کے تضادات موجود ہیں، ایسے موقع پر جب تک دین کا ایک جامع، مکمل نظامِ فکر وعمل نہ پیش کیا جائے تو سوسائٹی کے بنیادی تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے۔ اب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمیں غور وفکر کرنا ہے اور ان بنیادی امور کو سامنے رکھنا ہے، جن کی اساس پر ہم اجتماعی مسائل حل کرسکتے ہیں۔

دین کی تعلیمات کا ایک حصہ وہ ہے، جس کا تعلق عبادات یا اَخلاقیات اور عقائد کے ساتھ ہے۔ عبادات اور عقائد میں ہمیں چیلنج درپیش نہیں ہے۔ ہم سے بہتر عقائد اور عبادت کا طریقہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ اسی طریقے سے اَخلاقیات یا اصلاحی نقطۂ نظر سے کچھ اچھے اُمور کی نشان دہی اور اُن کی تلقین کرنے کا بھی چیلنج نہیں ہے۔ دورِ حاضر کا چیلنج اجتماعی نقطۂ نظر سے سوسائٹی کے اجتماعی مسائل سے متعلق ہے۔ جب تک سوسائٹی کے ان اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہم بنیادی اُمور طے نہیں کرتے تو ہم دراصل ان دونوں نظام ہائے حیات کے مقابلے پر دین کا ایک مکمل نظام پیش نہیں کرسکتے۔

اجتماعی نقطۂ نظر سے دینی تعلیمات کا جائزہ

سوسائٹی کے اجتماعی نقطۂ نظر کی تشکیل کے حوالے سے دین کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو جو بنیادی اُمور سامنے آتے ہیں،

www.rahimia.org

ان میں اہم ترین عدلِ اجتماعی کی اساس پر امن و امان قائم کرنے والی سیاست وحکومت اور خوش حالی پر مبنی معیشت کا نظام قائم کرنا ہے۔ اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کی تربیت یافتہ جماعت کے فکر و عمل کے تناظر میں انھیں سمجھا جانا آج کے دور کی بنیادی ضرورت ہے۔ دین اسلام کی تعلیمات کا مرکز اور منبع خود کتابِ مقدس قرآن حکیم ہے۔ اس کا دوسرا مرکز اور منبع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ ہے۔ اس کا تیسرا بنیادی ماخذ صحابہ کرامؓ کی اولوالعزم جماعت کا اجماع اور اجتہاد ہے۔ نیز جماعتِ صحابہؓ اور اُن کے تربیت یافتگان؛ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ ہیں، جن کے اجتماعی فکر و عمل کے سبب قرنِ اوّل کی سوسائٹی کی صورت گری ہوئی۔ ان حضرات کی تحریک سے سوسائٹی کے مسائل کے حل کرنے کے اصول اور ضابطے اخذ کیے گئے۔ چوتھا اہم ترین ماخذ جس سے ہم رہنمائی لیتے ہیں، وہ ان اولوالعزم مجتہدین کا اجتہادی عمل ہے، جس کے ذریعے سے وہ پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رہنمائی دیتے ہیں۔

عدلِ اجتماعی کے حوالے سے قرآنی تعلیمات

اجتماعی نقطۂ نظر سے اگر کتابِ مقدس قرآن حکیم کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو جو آیتِ مبارکہ ہم نے خطبے میں تلاوت کی ہے، وہ سورت الحدید کی آیت نمبر 25 ہے، اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ ''ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ہم نے ان پر کتابیں نازل کیں، اس کا ایک ہی ہدف تھا: لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ تاکہ کل انسانیت عدل و انصاف پر قائم ہوجائے۔ اس آیت میں ''النّاس'' کہا گیا ہے، **المسلم** یا **العرب** نہیں کہا گیا۔ یعنی بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب کل انسانیت کو عدل پر قائم کرنا دین کا بنیادی ہدف ہے۔ انبیا علیہم السلام کے دنیا میں آنے اور اُن پر کتابیں نازل ہونے کا یہی ایک مقصد اور ہدف بیان کیا گیا ہے۔

عدلِ اجتماعی کے حوالے سے نبویؐ تعلیمات

اسی طریقے سے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث جو امام بخاریؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہوئے لائے ہیں:

''کانت بنو إسرائیل تسوسهم الأنبیاءُ، کلّما هلک نبیّ، خلفه نبیّ آخر، ألا! لانبیّ بعدی. سیکون بعدی خلفاء، فیکثرون.'' (5)

یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اُن کے انبیاؑ کرتے تھے۔ یہ اتنا اہم اور عظیم الشان کام تھا کہ اُن کے بعد اُن کے خلیفہ بن کر دوسرے نبیؑ آجاتے۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نبوت کا دروازہ بند۔ اگر نبوت کا دروازہ بند ہے تو کیا سیاست کا دروازہ بھی بند ہے؟ حضورؐ نے اس سوال کا جواب دیا کہ: نہیں! میرے بعد میرے خلفا ہوں گے اور وہ بڑی کثرت سے ہوں گے۔ اور وہ وہی کام کریں گے جو انبیائے بنی اسرائیل کرتے رہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مشکٰوۃ میں یہ حدیث موجود ہے کہ:

''لا تزال طائفة من امّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّهم من خذلهم.'' (6)

(میری اُمت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر ضرور قائم رہے گی۔ انھیں کوئی نقصان پہنچانے والا یا مخالفت کرنے والا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔)

ایک روایت میں ''منصورین'' کہا گیا، یعنی جن کی مدد کی گئی۔ ایک روایت میں **اُمّة قائمة علیٰ الحقّ** کہا گیا کہ ''وہ حق

قائم کرنے والی جماعت ہوگی۔'' اور فرمایا گیا: آخر تک ایک جماعت رہے گی۔ گویا کہ یہ خلفا کسی مخصوص دورانیے پر جا کر ختم نہیں ہوں گے، بلکہ قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہ انبیاؑ کے اُس سیاسی عمل کو یا اجتماعی عمل کو سوسائٹی کے لیے جاری رکھیں گے۔

انسانی اجتماع کی اصل حقیقت ونوعیت

یہاں رُک کر ہم ذرا اس پر بحث کر لیتے ہیں کہ خود اجتماع کسے کہتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی اجتماع سماجی معاہدات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ افراد کے درمیان جو ورکنگ ریلیشن شپ ہوتی ہے، ایگریمنٹس ہوتے ہیں، سماجی معاہدات ہوتے ہیں، اس کے مجموعے کا عنوان انسانی اجتماع یا سوسائٹی ہوتا ہے۔ خواہ وہ معاہدہ مرد اور عورت کے معاہدۂ نکاح سے عبارت ہو، یا خریدار اور فروخت کنندہ کے معاہدۂ بیع سے عبارت ہو، یا اس سے بڑھ کر کسی شہری مملکت یا شہری ریاست کی تشکیل کا سماجی معاہدہ ہو۔ اور یوں کسی ریاست میں سوسائٹی کے تمام طبقوں کے درمیان Social Contract وجود میں آیا ہو، یا مختلف ریاستوں کے درمیان بین الاقوامی معاہدات یا بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت ہو اور بین الاقوامی انسانی اجتماع وجود میں آئے، یہ تمام سماجی معاہدات ہیں۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی اور اجتماع کے چار بنیادی دائرے اور مرحلے ہیں، جس کے لیے انھوں نے ''ارتفاقات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انسانی سہولتوں کے چار اجتماعی معاہدات، فیملی سسٹم سے لے کر بین الاقوامی معاہدات تک، ان معاہدات کے مجموعے کا نام 'اجتماع' ہے۔ گویا کہ افراد کے درمیان جو معاملات طے پاتے ہیں۔ ان کے جو اجتماعی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے، اس سے ایک اجتماع وجود میں آتا ہے اور ہر اجتماع کے پس پشت ایک معاہدہ کارفرما ہوتا ہے۔

سیرتِ نبویؐ کے تناظر میں سماجی معاہدات کی اجتماعی نوعیت

پھر نبی اکرمؐ کی سیرت کا اگر ہم مطالعہ کریں اور خاص طور پر اجتماعی نقطۂ نظر سے، امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بہت سے پہلو ہیں۔ عبادات کے حوالے سے، خود نبوت کے منصب کے حوالے سے آپؐ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں، ہمارا آج کا موضوع ''عدلِ اجتماعی'' کے حوالے سے ہے۔ آپؐ کی سیرت کو اگر ہم اجتماع کے تقاضوں کے تناظر میں دیکھیں تو انسانی اجتماعیت کو درست طور پر قائم کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری اجتماعی زندگی دو اہم ترین معاہدات کی تکمیل میں گزری۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تقریباً 570 عیسوی میں حضور اقدسؐ دنیا میں تشریف لائے اور 586 عیسوی میں آپؐ نے ایک معاہدہ کیا ہے، جسے ''حِلفُ الفُضول'' کہا جاتا ہے۔ یہ حقوقِ انسانیت کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے کے بارے میں حضورؐ نے نبوت کے بعد بھی اس حقیقت کو واضح کیا کہ اگر مجھے اس دور کی سب سے بڑی دولت سو سرخ اونٹ بھی دیے جائیں تو میں اس معاہدے سے منحرف نہیں ہوں گا۔ یہ معاہدہ آج بھی قائم ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ اس معاہدے کی بنیادی اساس کیا ہے؟ اس معاہدے کا تعلق انسانی اجتماع سے ہے۔

حِلف الفُضول؛ سیرتِ نبویؐ میں عدلِ اجتماعی کا پہلا اظہار

586 عیسوی میں مکہ کی سوسائٹی میں مکہ کے سنجیدہ لوگوں نے مل کر ایک معاہدۂ حِلف الفُضول کیا۔ ''فُضول'' فضل کی جمع ہے۔ اس لیے کہ جس طرح فضل نام کے بہت سے افراد اس معاہدے میں شریک تھے، اسی طرح ''فضل'' انسانی حق کو بھی کہا

جاتا ہے۔ حِلف الفُضول کا مطلب ہوا ''حقوقِ انسانیت کا معاہدہ''۔ حقوقِ انسانیت کے اس معاہدے میں جو بات بنیادی طور پر طے کی گئی، اور جس کا عہد کیا گیا، وہ یہ سماجی معاہدہ تھا:

''باللّٰه! لنکوننّ یداً واحداً مع المظلوم علیٰ الظّالم.'' (7)

(اللہ کی قسم! ہم سب مل کر ایک ایسی متحدہ قوت ہیں کہ جو ظالم کے خلاف مظلوموں کا ساتھ دے گی۔)

گویا اس معاہدے میں بنیادی طور پر دو طبقات مان لیے گئے: ایک ظالم اور دوسرا مظلوم۔ پھر ظالم کے خلاف ایک مزاحمتی معاہدہ وجود میں آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر 610 عیسوی میں وحی نازل ہوتی ہے۔ اس معاہدے سے لے کر نبوت کے منصب پر فائز ہونے تک — یعنی 586 عیسوی سے 610 عیسوی تک — آپؐ اپنی اگلی چوبیس سالہ زندگی میں یتیموں کے کام آتے ہیں۔ مسکینوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ نہ کما سکنے والوں کو کما کر دیتے ہیں۔ بخاری کے پہلے ہی باب ''بدء الوحی'' میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضورؐ کی سیرت کے جو پانچ بنیادی اُمور بیان کیے ہیں، ان کا تعلق انسانی خدمت سے ہے۔ اسی کی بنیاد پر حضرت خدیجہؓ نے کہا تھا کہ:

''واللّٰهِ! ما یخزیک اللّٰه أبداً.'' (8) (اللہ تعالیٰ کی قسم! کہ اللہ آپ کو کبھی بھی رُسوا نہیں کرے گا۔)

اس لیے کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ جو لوگ کما نہیں سکتے، انھیں کما کر کھلاتے ہیں۔ مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد اور تعاون کرتے ہیں۔ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چوبیس سال کے اس عرصے میں آپؐ نے ہر مظلوم کی مدد کی۔ روایات میں آتا ہے کہ مکے کا سردار ابوجہل آپؐ سے چھپتا پھرتا تھا کہ کہیں حضورؐ کسی مظلوم کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور معاہدے کے تحت اس کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کریں۔

حضور اقدسؐ اس پر مسلسل غور و فکر فرماتے رہے کہ یہ انفرادی عمل کتنے مظلوموں کی مدد کر سکتا تھا؟ مظلوموں پر ظلم کے خاتمے کا کوئی مستقل نظام قائم ہونا ضروری ہے۔ اس حوالے سے آپؐ پریشان ہیں۔ جس کا تذکرہ قرآن نے کیا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (9) (ہم نے آپؐ کو سرگرداں اور پریشان پایا تو ہم نے آپؐ کو راستہ بتلایا۔)

چناں چہ وحیٔ الٰہی کے ذریعے سے ہدایت کا راستہ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت العلق میں واضح کر دیا۔ پہلی ہی سورت کی ابتدائی پانچ آیات میں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (10) سے لے کر پہلی پانچ چھ آیات میں اللہ کا نام پڑھنے اور اُس کا تعارف کرانے کے بعد مظلوموں پر ڈھائے جانے والے اس ظلم کے خاتمے کا ایک مکمل پروگرام بتا دیا گیا۔ اس حوالے سے اس سورت میں تین دفعہ ''کلا'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس پروگرام کے تین بنیادی نکات ہیں:

1۔ نظامِ ظلم کو قبول کرنے سے انکار

سب سے پہلے ظلم کے نظام کو قبول کرنے سے انکار کر دینا۔ اس طرح ظلم کے خلاف ایک مزاحمتی فکر اور نظریہ دیا گیا۔ سب سے پہلے کہا گیا کہ: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (11) یعنی خبردار! یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں پر سرکشی اور ظلم کرے، طاغوتی نظام قائم کرے۔ یہ بعینہٖ وہی جملہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور پہاڑ پر کہا گیا کہ: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (12) جاؤ فرعون کی طرف کہ اس نے سرکشی کی ہے۔ فرعون نے کیا کام کیا تھا؟ قرآن نے دوسری جگہ

www.rahimia.org

سورت القصص میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (13)

فرعون نے زمین میں سرکشی کی ہوئی تھی اور انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک جماعت کو کمزور بنا رکھا تھا۔ ان کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ بے شک وہ زمین میں فساد مچانے والوں میں سے تھا۔ اس طبقاتی نظام کو واضح کرنے کے لیے قرآن حکیم میں جا بہ جا **مستضعفین** اور **مستکبرین** کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

یہی پس منظر حضورؐ کی بعثت کا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے نازل ہونے والی تیسری سورت المزمل میں اس طرح بیان کیا ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ (14) کہ ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا، تم پر وہ ایسا ہی نگران ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف موسیٰ کو بھیجا تھا۔ گویا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح مکہ کے ظالم ابوجہل اور یہاں کے ظالم سرداروں کی طرف بھیجا گیا۔

2۔ ظالم طاقت اور قوت سے مقابلہ

سورت العلق میں دوسرے ''کـــلا'' کے بعد فرمایا کہ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا ۢ بِالنَّاصِيَةِ ۝ (15) (اگر یہ باز نہ آئے تو ہم اس کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹ لیں گے۔) گویا کہ مظلوموں سے کہا جا رہا ہے کہ گھبراؤ مت۔ بلالؓ وصہیبؓ اور یاسرؓ سے کہا جا رہا ہے کہ اٹھو مظلومو! غلامو! جو پسے ہوئے طبقے ہیں، اٹھو اور اٹھ کر اس کی پیشانی گھسیٹ لو۔ گھبراؤ نہیں، اس لیے کہ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ (16) (یہ پیشانی جھوٹی اور مجرم ہے۔) انسانیت کے خلاف اس نے بغاوت کی ہے۔ ڈرو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ (17) یہ اپنے دارالندوہ کے جو شریک سردار ہیں، ان کو بلائے گا۔ تو اسے بلانے دو۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ (18) ہم بھی اپنی ''زبانیه'' مقابلے پر لائیں گے۔ اب اس کی ''نادیه'' اور ہماری ''زبانیه'' کا مقابلہ ہوگا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ''زبـــانیـــه'' کا ترجمہ کیا ہے کہ ہم بھی اپنے سیاسی پیادے میدان میں لائیں گے۔ میدانِ جنگ کے نقشے میں پیادوں کا ایک بڑا ابنیادی کردار ہے۔ وہ کون سے ''سیاسی پیادے'' ہیں، جو حضورؐ نے گیارہ بارہ سال کی سیاسی جدوجہد سے تیار کیے؟ اس عرصے میں آپؐ نے تین سو تیرہ کی صحابہ کی اولوالعزم جماعت بنائی۔ جس نے غزوۂ بدر کے موقع پر کردار ادا کیا۔ قرآن اس کا تذکرہ کر رہا ہے۔ یہ انقلابی جماعت ہے۔ جس نے اس ظلم پر مبنی نظمِ اجتماعی کو زمین بوس کر دیا۔

3۔ ظلم کے نظام کی اطاعت سے انکار

سورت العلق میں تیسری مرتبہ ''كَلَّا'' کا لفظ استعمال کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ: لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (19) (اس ظالم سرکش کی اطاعت نہیں کرنی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور اس کا قرب حاصل کرو)۔ گویا کہ کسی بھی حال میں ظالم اور سرکش نظام کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں کرنی، بلکہ اُس کی مزاحمت کر کے اُسے راستے سے ہٹانا۔

ان انقلابی نکات پر جماعتِ صحابہؓ کی تیاری اور بدر میں کامیابی

چناں چہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے ساتھ سچے تعلق کے بعد ان تین نکات پر مشتمل ایک تربیت یافتہ انقلابی

www.rahimia.org

جماعت صحابہ کرامؓ پر مشتمل بنائی۔ اس جماعت نے پوری اولوالعزمی کے ساتھ ان تینوں نکات کی روشنی میں مکے کے ظالم سرداروں کو شکست دے کر عدلِ اجتماعی کا نظام قائم کردیا۔ اس انقلابی جماعت کی تعریف اللہ تعالیٰ نے یوں کی کہ:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (20)

(اللہ تعالیٰ اس جماعت سے محبت کرتا ہے، جنھوں نے اللہ کے راستے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر لڑائی کی۔)

اس جماعت نے غزوۂ بدر کے موقع پر انقلابی جدوجہد اور کوشش کی۔ بدر کے مقام پر مقابلے اور مزاحمت سے پہلے عام طور پر جو جنگیں ہوا کرتی تھیں، وہ ہجومی انداز کی ہوتی تھیں؛ ایک ہجوم دوسرے ہجوم پر حملہ آور ہوا کرتا تھا۔ حضورؐ نے اس جنگ میں نیا انقلابی ڈسپلن دیا، ہجوم کے بجائے افراد میں نظم و ضبط قائم کیا، اُن کی صف بندی کی، یوں ایک ڈسپلن کے تحت حضورؐ نے یہ جنگ لڑی۔ روایات کے مطابق میدانِ جنگ کا نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ حضورؐ نے تین صفیں بنائیں اور سب سے اوپر آپؐ نے اپنا ہیڈکوارٹر بنایا۔ آپؐ نے وہاں سے جو ہدایات دیں، اس کے مطابق پوری صف بندی کے ذریعے سے دشمن کا مقابلہ کیا گیا۔ گویا کہ تنظیمی طاقت اور قوت کے ذریعے سے اس ظلم کے نظام کو ختم کردیا۔ اس موقع پر ستر بڑے بڑے ظالم سردار قتل کردیے اور ستر بڑے بڑے ظالم سرداروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ گویا کہ ظلم پر مبنی اُس پورے نظم اجتماعی کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

اس طرح حضورؐ کی سیرت کے پہلے سماجی معاہدے ''حِلف الفُضول'' کی غزوۂ بدر پر تکمیل ہوجاتی ہے۔ آپؐ کی سیرت کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے بعد بھی حضور اقدسؐ نے اس معاہدے کی اساس پر قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی دس سالہ مکی زندگی اور پھر مدینہ منورہ میں پہنچ کر غزوۂ بدر تک وہ تمام کام کیے جو پہلی سورت العلق میں بہ طورِ ہدف کے بیان کردیے گئے تھے کہ کسی انسان کی سرکشی اور ظلم قابلِ قبول نہیں۔

سیرتِ نبویؐ میں عدلِ اجتماعی کا دوسرا اظہار؛ میثاقِ مدینہ

اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی ریاست کی تشکیل کی کہ اب ظلم کا مکے پر مسلط نظام ختم ہوگیا اور اس کی جگہ پر ریاست کی تشکیل کے لیے ایک نئے Social Contract کی ضرورت ہے۔ آپؐ کی اجتماعی زندگی میں دوسرا اہم ترین سماجی معاہدہ وہ ہے، جسے ''میثاقِ مدینہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ باوَن دفعات پر مشتمل ہے، جو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانوں کے انسانی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے کیا گیا۔ اس موقع پر مدینے کی آبادی دس ہزار ہے، جس میں سے مرد عورت اور بچے ملا کر کل پانچ سو مسلمان ہیں۔ ساڑھے نو ہزار غیرمسلم ہیں۔ یہودیوں کے بارہ سے زیادہ قبائل ہیں، ہر قبیلے سے حضورؐ ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ میثاقِ مدینہ میں یہودیوں سے کیے گئے معاہدے کے الفاظ یہ ہیں:

''إنّ یھود بنی عوف اُمّۃٌ مع المؤمنین.''(21)

(بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک اُمت ہیں۔)

ظاہر ہے یہ ''اُمت'' اسلام کے نقطہ نظر یا یہ عقیدے کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ اجتماعی نقطہ نظر سے، سیاسی اور معاشی حوالے سے قائم اجتماعیت پر مبنی ہے۔ اس طرح مدینہ منورہ میں بلاتفریق رنگ، نسل مذہب عدلِ اجتماعی کی اساس پر ریاست کی تشکیل کی گئی۔ اس معاہدے کی بنیاد پر قائم ریاست کی قومی تکمیل کا عمل فتح مکہ کے موقع پر ہوجاتا ہے۔ مکہ پر مسلط ظالم حکمرانوں کا ریاستی نظام

www.rahimia.org

ٹوٹ جاتا ہے اور میثاقِ مدینہ کی اساس پر عدلِ اجتماعی پر مبنی ریاستی نظام پورے جزیرۃ العرب پر غالب آجاتا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر عدلِ اجتماعی کے امور کا تعین

حضورؐ کی سیرتِ اجتماعی ان دو معاہدات کی صورت میں تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدسؐ کا خطبہ عدلِ اجتماعی کے بنیادی امور کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس موقع پر حضورؐ فرماتے ہیں:

''**ألا! إنّ دمائكم و أموالكم حرام كحرمة يومكم هٰذا، في بلدكم هٰذا، في شهركم هٰذا.**'' (22)

(خبردار! آج کے بعد تمھارے خون اور تمھارے مال اسی طرح محترم ہیں، جیسے خانہ کعبہ محترم ہے، جیسے یہ دن محترم ہے، جیسے یہ جگہ محترم ہے۔)

اس طرح حضورؐ کی سیرت کا اجتماعی نقطۂ نظر سے مطالعہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ انسانی سماج کی اجتماعی تشکیل انسانی جان کی حفاظت اور انسانی محنت سے کمائے گئے مال کی حفاظت پر مبنی ہونی چاہیے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بنیادی پہلو ہے۔

سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کے دو بنیادی مقاصد

سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کے یہی دو مقاصد ہوتے ہیں۔ آج ہمارے سامنے اجتماعیات، سوشیالوجی کا بنیادی علم انھیں دو حقیقتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ پولیٹکل سائنس اور اکنامکس کے بنیادی اہداف یہی ہیں کہ:

1۔ سوسائٹی میں امن و امان کو یقینی بنانا اور Law & Order قائم کرنا، سوسائٹی میں دہشت اور خوف کی حالت کو ختم کرنا۔ یعنی انسانی جان، مال، عزت آبرو کا تحفظ، حکومت کا پہلا اور بنیادی فریضہ ہے۔ اپنے جیسے انسانوں کی اپنے پر حکومت صرف اسی لیے قبول کی جاتی ہے کہ وہ ہمیں داخلی دشمنوں، چوروں، قاتلوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بچائے۔ اور خارجی طور پر ملک سے باہر کی کوئی حملہ آور قوت ہو تو اُس کے مقابلے میں ہماری سیکیورٹی فورسز ہمارے ملک اور ہماری ریاست کا دفاع کریں۔ اس کے علاوہ تو حکومت کے قیام کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

2۔ خوش حالی پر مبنی منصفانہ معاشی نظام قائم کرنا۔ جب معاشی سسٹم بنایا جاتا ہے تو اس کا مطلب معاشی نقطہ نظر سے چار چیزوں کو واضح کرنا ہے: یعنی (۱) دولت کی وافر مقدار میں پیدائش (Production of Wealth)، (۲) دولت کی منصفانہ تقسیم (Distribution of Wealth)، (۳) دولت کے تبادلے (Exchange of Wealth)، (۴) اُس پیدا شدہ اور تبادلہ شدہ دولت کے صَرف (Consumption of Wealth) کے اصول اور ضابطے متعین کیے جائیں، یعنی انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کی پیدائش، اس کی تقسیم، اس کے تبادلے اور اس کے استعمالات کے سسٹم کیا ہوں گے؟ اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ مال کی تقسیم منصفانہ طور پر تبھی ہوسکتی ہے کہ جب یہ چاروں پہلو ایک ترتیب کے ساتھ سوسائٹی میں فروغ پذیر ہوں۔

قرآنی نقطہ نظر سے مثالی معاشرے کی دو خصوصیات

اسی کو قرآن حکیم نے مثالی معاشرہ کہا ہے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

www.rahimia.org

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (23)

(اللہ تعالیٰ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے کہ جو امن والی تھی اور اس میں ایسا اطمینان تھا کہ اس کا رزق ہر جگہ سے وافر مقدار میں آتا تھا۔)

قرآنی نقطۂ نظر سے مثالی سوسائٹی وہ ہے جس میں امن ہو۔ یعنی ایسا مستحکم سیاسی نظام ہو، جو تمام انسانوں کو امن دے۔ اور دوسری بات کہی گئی کہ ایسی مطمئن زندگی بسر کرے کہ اُس کے معاشی وسائل ہر پہلو سے وافر مقدار میں اُس سوسائٹی میں آ جائیں۔ گویا کہ اس میں ہر طرح معاشی خوش حالی ہو۔

عدلِ اجتماعی کے ان دو اصولوں کی اہمیت

عدلِ اجتماعی کے یہ بنیادی اُمور سیرتِ نبویہؐ سے واضح ہوتے ہیں۔ جب تک مسلمانوں نے سیرت کے یہ اصول اور قرآن حکیم کی یہ تعلیم پیش نظر رکھی، دنیا میں غالب رہے، اُن کا نظام قائم رہا۔ انھوں نے اجتماعیت میں اپنا ایک کردار ادا کیا۔ بین الاقوامی سیاست اور قومی سیاست میں اُن کی شناخت قائم رہی۔ اُن کے معاشی سسٹم نے انسانی مسائل حل کیے۔ لیکن جب سے یہ بنیادی اصول ہماری نظروں سے اوجھل ہوئے۔ ہم نے انسانی نظریے پر سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کو پس پشت ڈال دیا۔ ہم نے فرقہ وارانہ گروہیت کی بنیاد پر سوسائٹی کے اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کو چھوڑ دیا۔ تب سے زوال کی حالت میں ہیں۔

اسلام میں ایک ہے عبادات اور عقائد کا معاملہ۔ عقائد اور عبادات کی تو دعوت ہے۔ اس پر کوئی جبر یا زبردستی کا عمل نہیں ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (24) اُس کا تعلق تو ہر فرد کی اپنی ذاتی رضا اور خوشی سے ہے۔ عقیدہ قبول کرنے اور اعمال کرنے سے ہے۔ اسلام کا دوسرا پہلو سوسائٹی کا نظمِ اجتماعی ہے۔ اس کے قیام کے لیے تو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب کوئی مسلمان ہو، یہودی ہو، عیسائی ہو، ہندو ہو، کوئی بھی اُس کے اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کو پیش نظر رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی بھی اپنا فیصلہ کرانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں۔ اس زمانے کے ایک واقعے میں منافق مسلمان یہودی سے کہتا ہے کہ تمھارے سردار کعب بن اشرف سے فیصلہ کرایا جائے۔ جب کہ وہ یہودی کہتا ہے کہ نہیں! ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ مطلوب ہے۔ (25) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات میں عدل بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب ہے۔

دینی تعلیمات کی روشنی میں سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی امور

سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کے لیے درجِ ذیل تین بنیادی اُمور ہیں:

1۔ پہلی بنیادی چیز ایسا نظریہ اور فکر و عمل رکھنا، جو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانوں کے اجتماعی حقوق کی ادائیگی پر مشتمل ہو۔ کسی مخصوص فرقے، مخصوص گروہ، نسلی، مذہبی، ثقافتی، لسانی بنیادوں پر کسی مخصوص طبقے کے لیے اجتماعی نظام کا کوئی تصور اسلام کی تعلیمات میں نہیں ہے۔

2۔ دوسری بنیادی چیز کہ اُس نظریے کی اساس پر ایسا سیاسی اور مستحکم نظام قائم کرنا، جو سوسائٹی میں تمام انسانوں کی جان، مال اور عزت آبرو کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی مشرقی، کوئی مغربی، کسی نسل، کسی مذہب، کسی ثقافتی شناخت سے تعلق رکھتا ہے، اُس کو امن مہیا کرنا دین اسلام کی تعلیمات کے نظمِ اجتماعی اور سیاسی سسٹم کی بنیاد ہے۔

3۔ سوسائٹی کی تیسری بنیادی چیز ایسا منصفانہ معاشی نظام قائم کرنا کہ جو بلا تفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانوں کے معاشی حقوق کی ادائیگی پر مشتمل ہو۔ دولت کی پیدائش میں بھی پوری سوسائٹی اجتماعی طور پر شریک ہو۔ دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہو۔ دولت کے تبادلے کے عمل میں بھی کسی خطے یا نسل یا کسی خاص طبقے کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ اور اُس کے استعمالات بھی سوسائٹی کے قومی اور ملّی تقاضوں کے مطابق سوسائٹی کے لیے یکساں طور پر ہوں۔

معاشروں کے زوال کی وجوہات اور انقلاب کی اہمیت

اسی پس منظر میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک جب انسانی معاشرے وجود میں آئے اور جیسے جیسے اجتماعات نے ترقی کی ہے، ''**الرّأیُ الکُلّی**'' یعنی اجتماعی مفاد کے مطابق یہ تین بنیادی اَقدار ہر سوسائٹی کے بنیادی لوازمات میں سے رہی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کسی معاشرے پر وہ لوگ جو (بہ قول امام شاہ ولی اللہؒ) ''**الرّأی الجُزئی**'' یعنی انفرادیت پر مبنی سوچ، ذاتی خواہشات اور انفرادی رائے رکھنے والے طبقے حکمران بن جائیں تو ایسی سوسائٹی میں یہ لوگ حکومتی اداروں اور حکومتی اتھارٹی کو ذاتی، طبقاتی اور گروہی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کا ایک مبحث ''**الارتفاقات**'' کے عنوان سے ہے، اس کے آخری باب ''**باب الرّسوم السّائرۃ فی النّاس**'' میں شاہ صاحبؒ نے واضح طور پر یہ بات کہی کہ سوسائٹی کے ان اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنا ''**بمنزلۃ القلب من جسد الانسان**'' یعنی ''ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی جسم میں دل ہوتا ہے''، جس کے بغیر سوسائٹی اجتماعی طور پر ترقی نہیں کرسکتی۔ کسی سوسائٹی پر اگر خواہش پرست، انفرادیت پسند لوگ مسلط ہو جائیں تو دراصل سوسائٹی میں فساد واقع ہو جاتا ہے۔

ایسے حالات میں اجتماعی سوچ رکھنے والوں کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''**یجب بذل الجھد علیٰ أھل الاراء الکلیۃ فی إشاعۃ الحقّ، و تمشیتہٖ، و إخمال الباطل، و صدّہٖ، فرُبما لم یمکن ذٰلک إلاَّ بمُخاصمات، أو مُقاتلات، فیُعدّ کلّ ذٰلک من أفضل أعمال البرّ.**'' (26)

(جو مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والے اور اجتماعی تقاضوں کو سمجھنے والے لوگ ہیں، ان پر حق کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کی جدوجہد کرنا واجب اور فرض ہے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسے انفرادیت پسند یا باطل سوچ رکھنے والے لوگوں کو راستے سے ہٹائیں۔ بسا اوقات یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک کہ مزاحمتی نقطہ نظر سے جدوجہد اور کوشش نہ کرے اور ایک مرحلہ ایسا آئے کہ آپ کو اُن سے لڑائی لڑنا پڑے۔ ان حالات میں ایسا کرنا اُس دور کی نیکیوں میں سب سے بہترین نیکی ہے۔)

سوسائٹی کی ایسی نیکی جس کا تعلق عدلِ اجتماعی کے قیام سے ہے، یہ دین اسلام کی تعلیمات کا بنیادی پیغام ہے۔

زرعی اور تجارتی دور میں عدلِ اجتماعی پر مبنی نظام

اب آپ دیکھئے کہ اس عدلِ اجتماعی کی روشنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی نظام ایسے زمانے میں درست کیا جسے زرعی دور کہا جاتا ہے۔ تاریخ کا زرعی دور وہ ہے کہ جس میں پیداواری عمل زیادہ تر زراعت کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ دست کاری یا صنعت کاری کا حصہ بہت ہی معمولی تھا۔ اس کے بعد عدلِ اجتماعی کی اساس پر تجارت کا نظام قائم کیا۔ چناں چہ خلفائے

www.rahimia.org

راشدینؓ کے زمانے میں ان اصولوں کی روشنی میں تجارتی دور کے پیداواری رشتوں کو استوار اور مدوّن کیا گیا۔ پھر جیسے جیسے تجارتی عمل آگے بڑھا اور مسلمانوں کے بحری بیڑے اور اُن کے تجارتی قافلے دنیا بھر میں گھومے پھرے۔ ایسے دور میں انھوں نے تجارتی نظم ونسق قائم کرتے ہوئے تجارتی دور کے پیداواری رشتے اور اُن کے باہمی تعلقات کو ان بنیادی اساسی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے دور کا بہترین معاشی نظام تشکیل دیا۔

صنعتی دور کے پیداشدہ مسائل اور حالات

اٹھارہویں صدی عیسوی میں صنعتی حوالے سے پیدائشِ دولت کا نیا دور شروع ہوتا ہے کہ جب دنیا کی سوسائٹی زرعی دور اور تجارتی دور کی بگڑی ہوئی صورتوں یعنی فیوڈل اِزم (Feudalism) اور مرکنٹائل اِزم (Mercantilism) سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہوتی ہے، صنعت (Industry) کی اساس پر پیداواری عمل آگے بڑھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ (Capital) وجود میں آتا ہے۔ ایسے میں سرمائے کی تخلیق ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ سرمائے کا جن اور دیو باہر نکل آتا ہے، جس سے سرمایہ داری نظام (Capitalism) وجود میں آتا ہے۔

مرکنٹائل اِزم اور کیپٹل اِزم کے سنگم پر ایڈم سمتھ نے 1776ء میں اپنی کتاب ''دولتِ اقوام'' لکھی۔ اُس نے اس پیدا شدہ ''قدرِ زائد'' یا پیداواری عمل کے ذریعے سے وجود میں آنے والے کیپٹل کی ترقی اور مزید بڑھوتری کے اصول اور ضابطے متعین کیے۔ معاشی حوالے سے پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت، اور صرفِ دولت کے چار مراحل میں سرمایہ دارانہ نظریات متعین کیے۔ جیسے جیسے سرمائے نے ترقی کی، یورپ میں زائد پیداواری عمل نے سرمایہ داری کی میتھاڈولوجی (Methodology) سوسائٹی پر مسلط کردی۔ جب اُس کے خوف ناک اثرات یورپ پر مرتب ہوئے تو اس کا ایک ردّعمل پیدا ہوا۔ اُس ردّعمل کے نتیجے میں کارل مارکس نے ''داس کیپٹل'' لکھ کر کیپٹل کی تخلیق کے بنیادی اصول وضوابط کو چیلنج کیا۔ اس نے کیپٹل اِزم کو کنٹرول کرنے کے لیے اس کے مقابلے پر بالکل متبادل ایک مکمل فلاسفی کیمونزم (Communism) اور سوشلزم (Socialism) کی صورت میں پیش کی۔ اپنے ایک ساتھی اینگلز کے ساتھ مل کر کیمونسٹ مینی فیسٹو (Communist Manifesto) لکھا۔

اس دور میں مسلمانوں کی حالتِ زار

سوال یہ ہے کہ اسی زمانے میں عالمِ اسلام شکست کھا رہا ہے۔ اس کا تجارتی اور صنعتی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔ صنعتی دور نے آکر زرعی اور تجارتی دور کے بیمار معاشروں پر تسلط حاصل کیا۔ مسلمان معاشرے صنعتی دور (Industrial Age) اتیج میں ایسی حالت میں داخل ہوئے کہ وہ غلام بن چکے تھے۔ اپنے معاشروں کے حتمی فیصلے کرنے کا اختیار اُن کے پاس نہیں تھا۔ خاص طور پر برعظیم پاک و ہند پر 1757ء میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریز سامراج نے یہاں کی سوسائٹی پر اپنا تسلط قائم کیا۔ اس دوران صنعتی انقلاب کی آمد کے ساتھ سیاسی فیصلہ سازی کا عمل دین اسلام کی تعلیمات کے ماننے والوں کے پاس نہیں رہا، بلکہ یہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے تسلط حاصل کرنے کے بعد سرمایہ دارانہ اصولوں کو اپلائی کیا۔ پھر 1858ء میں برٹش شہنشاہیت کا اس خطے پر تسلط قائم ہوا۔

www.rahimia.org

اس زمانے میں سرمایہ دارانہ اصولوں پر غدار سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے تحفظ کے لیے باقاعدہ ایک پورا سسٹم؛ عدالتی نظام، سیاسی نظام، معاشی نظام سوسائٹی پر مسلط کیا گیا، یہاں تک کہ جنگِ عظیم اوّل میں خلافتِ عثمانیہ کا بستر لپیٹ کر انسانیت کو غلامی کے ایک نئے دور میں داخل کر دیا گیا۔ جنگِ عظیم اوّل میں دنیا کی دو سپر پاورز فرانس اور برطانیہ وجود میں آتی ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی وحدت پر مبنی خلافتِ عثمانیہ اور مسلمانوں کی حکومت اور طاقت توڑ دی۔ ان کے علاقوں کی بندر بانٹ کی۔ بہ ظاہر اسلام کے نام پر تقسیم در تقسیم کر کے کئی نئے ملک بنا دیے گئے۔ عرب قومیت کے عنوان سے عربوں کو ترکوں سے لڑا دیا گیا۔ اس طرح مسلمان خطوں میں تقسیم در تقسیم کا عمل ہوا۔

زوال کے اس دور میں ہماری ذمہ داریاں

ایسے حالات میں جب مسلمانوں کا بین الاقوامی ڈھانچہ ٹوٹ چکا، ان کا قومی نظام اپنے علاقوں میں ٹوٹ چکا۔ اب دنیا بھر میں اس وقت جتنی بھی سیاسی اور معاشی تقسیم ہے، وہ دراصل اُن قوتوں کے قبضے کی وَجہ سے ہے، جو اس وقت سیاسی طور پر بالادست ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی طاقتوں میں اس وقت پانچ ویٹو پاور رکھنے والی قوتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مسلم ملک شامل نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مکمل یکسوئی کے ساتھ ایک ایسے فکر و عمل کو اختیار کریں، جو تاریخ اسلام میں بارہ سو سالہ دور میں اجتماعی تشکیل کے بنیادی اساسی اصول اور فکر و عمل پر مبنی رہا ہے۔ ہمارے سامنے یہ رہے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق عدل، امن اور معاشی خوش حالی کے اصولوں کی روشنی میں بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب انسانیت کی اجتماعی تشکیل کرنا ہے۔ یقیناً آپ اس گزرے ہوئے دو سو سالہ دور میں برپا ہونے والے صنعتی دور یا آگے چل کر وجود میں آنے والے ڈیجیٹل دور کو ریورس تو نہیں کر سکتے۔ آپ پیچھے نہیں جاسکتے کہ جاگیرداری کی اساس پر زرعی ماحول میں داخل ہو جائیں۔

ہمارے یہاں دو طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں: ایک تو یہ کہ ہمیں جدیدیت کو اس کے تمام تر افکار سے مرعوب ہو کر انھیں مِن وعَن قبول کرنا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہم اسلام کے نام پر کوئی ایسا تعارف یا تشریح پیش کریں جو آج سے ہزار سال پہلے یا پانچ سو سال پہلے کے زرعی یا تجارتی دور کے تقاضوں کے تحت متعین کی گئی تھی۔ جس پیراڈائم میں وہ بات کہی گئی، یا قانون سازی کی گئی، یا ضمنی قوانین (Bylaws) بنائے گئے تھے، اُن تصورات کے تحت ہم اسلام کی تفہیم کریں۔ یہ دونوں طرح کے تصورات درست نہیں ہیں۔ اس طرح کے تصورات کے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ یہ کہ جو دو ڈھائی سو سالہ مغلوبیت کا دور ہے اور اس میں نئے چیلنجز سامنے آئے ہیں۔ صنعتی دور کے نئے تقاضے سامنے آئے ہیں۔ اس کے مطابق ہم نے گفتگو اور بات چیت کا عمل آگے نہیں بڑھایا۔ پھر ایسے حالات میں ہم نے عقائد اور عبادات کے ذیلی اور ضمنی جھگڑے بھی کھڑے کر لیے۔ اس طرح مذہب سوسائٹی کے مسائل کے حل کرنے کے بجائے مذہبی لڑائی جھگڑے اور افتراق و انتشار اور تقسیم در تقسیم کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

اس دور کے حوالے سے ولی اللّٰہی سیاسی اور معاشی افکار

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کے حل کرنے کے حوالے سے کوئی بات چیت کی جاتی۔ عدلِ اجتماعی کے اساسی اصول کی روشنی میں بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب آج کے اس صنعتی اور ڈیجیٹل دور

کے پیداواری رشتوں کو نئے خطوط پر استوار کرنے کے حوالے سے غور و فکر کیا جاتا۔ اس پر توجہ دی جاتی کہ پیدائشِ دولت کے جو اصول دینِ اسلام کی تعلیمات نے دیے ہیں، انھیں ان صنعتی پیداواری عمل میں کیسے اپلائی کیا جائے؟ اسی طریقے سے تقسیمِ دولت، تبادلہ دولت اور صَرفِ دولت کے مراحل میں عدلِ اجتماعی کے اسلامی اصولوں کا اطلاق کیسے ہوگا؟ ان امور پر غور و فکر کیا جاتا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشی حوالے سے عدلِ اجتماعی کے تصور کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''مِن فقه الرّجل أن ينظر إلىٰ حاجته، فليختر كسباً يكفى لها.'' (27)

(آدمی کی سمجھ داری کی ایک بات یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی معاشی ضرورتوں اور حاجات کو سامنے رکھے اور پھر ایسی معاشی سرگرمی اختیار کرے کہ جس سے اُس کی حاجات پوری ہو جائیں۔)

ہر ملک، ہر قوم، ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں جو انسانی احتیاجات ہیں، ان کا تعین کرے اور اُن احتیاجات کی تکمیل کے لیے ایک معاشی سسٹم بنائے۔ ایسے پیشے وجود میں لائے جائیں، جس سے سوسائٹی میں دولت کی منصفانہ تقسیم کا اجتماعی عمل وجود میں آئے۔

اسی طریقے سے اس دور میں سیاسی نظام میں ایک نیا عنصر داخل ہوا۔ شخصی حکومتوں کا دور بدل کر جمہوری حکومتوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ قومیت کی بنیاد پر اجتماعی نظم و نسق کا عمل شروع ہوتا ہے تو عدلِ اجتماعی کی اساس پر اس سیاسی عمل کے تقاضے کیسے پورے کیے جائیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سیاسی تشکیل کے حوالے سے اپنے زمانے میں یہ بات کہی کہ اب اگلا دور اجتماعیت کا آرہا ہے، اس لیے سوسائٹی کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نظامِ حکومت اجتماعیت پر مبنی ہو۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ:

''اجتماع عقلاء القوم و مبرزيهم.'' (28)

(قوم کے عقل منداور منتخب لوگوں کا اجتماع ملکی نظم و نسق چلائے۔)

اس طرح شاہ صاحبؒ نے بہت پہلے اس طرف توجہ دلائی کہ سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کے حل کرنے کے لیے سوسائٹی کے عقل منداور منتخب لوگوں کا اجتماع یا پارلیمنٹ فیصلہ سازی کرے۔ آپ دیکھیے کہ آنے والے دور میں جمہوریت کا ایک چیلنج سامنے کھڑا ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ شاہ ولی اللہ کے فکر میں وہ بنیادی اُمور ہیں، جو اس صنعتی دور کے ان سوالات کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پھر شاہ صاحب نے سیاسی اور معاشی حوالے سے یہ اعلیٰ افکار ہی پیش نہیں کیے، بلکہ انھوں نے ان افکار کے پیچھے کارفرما دین اسلام کی مکمل فلاسفی کو مرتب اور مدوّن کیا۔ چناں چہ انھوں نے اپنی شاہکار کتاب ''حُجّةُ اللّٰه البالغه'' کے ابتدائی سات مباحث میں ایسے قواعدِ کلیہ منضبط کیے، جو دین اسلام کے مکمل نظامِ فکر و عمل کی وضاحت کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کا پورا ایک فلسفہ فکر بنایا اور اُس کی روشنی میں مسائل کے حل کرنے کے لیے بات کی۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفے کی اہمیت

ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اس زوال کے زمانے میں اس خطے میں بہت سے مفکرین آئے۔ انھوں نے اپنی اپنی تھیوریز

www.rahimia.org

بنائیں، لیکن وہ تمام تر نظریاتی سکیمیں یورپ سے متأثر ہوکر بنائی گئیں۔ وہ دینِ اسلام کی اوریجنل تعلیمات کے تناظر میں نہیں ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ چوں کہ یورپ کی غلامی کے اس دور سے پہلے کے آدمی ہیں اور وہ بہ یک وقت محدث بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، ایک صوفی بھی ہیں، انسانی روح کے امراض کو سمجھ کر ان کے علاج کرنے کی اہلیت اور صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ شریعت، طریقت اور سیاست تینوں شعبوں کے جامع ہیں اور یورپ کی مرعوبیت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں جو نظامِ فکر وعمل اور فلسفۂ سیاست ومعیشت متعین کیا اور اس کا ایک مکمل اور مربوط طریقۂ فکر وشعور دیا ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں اُسے علمی اور فکری بنیادوں پر سمجھنا ہے۔ ٹھیک ہے کہ شاہ صاحبؒ کی فلاسفی کے بہت سے پہلو ایسے ہیں، جنھیں عام لوگوں کے لیے سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے دماغ پر زور پڑتا ہے، لیکن شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ کے مقدمے میں کہا ہے کہ آخر مشکلات کو حل کرنے سے ہی مسائل حل ہوتے ہیں۔ مشکلات کو نظرانداز کردینے یا چیلنج کو قبول کرنے سے پیچھے ہٹنے سے تو مسائل حل نہیں ہوتے۔

آج کے اس دور میں ہماری ذمہ داریاں

آج ہمیں دین اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں اُس فلسفۂ فکر کو سامنے رکھ کر عدلِ اجتماعی کے ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے، جس کے ذریعے سے سوسائٹی کو مجموعی طور پر دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل ہو۔ اپنے فکر وعمل سے اس کا ایک مکمل نمونہ پیش کرنا ہے۔ مسلمانوں پر یہ قرض بھی ہے اور ان کا اسلامی فرض بھی ہے۔ ان کا یہ انسانی فرض بھی ہے اور دینی تقاضا بھی ہے۔ قومی اور ملّی تقاضا بھی ہے کہ ہم نے یہ ریاست پاکستان اسلام کے نام پر لی ہے۔ ایسے میں ضروری ہوجاتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے تناظر میں ایک مکمل سسٹم پیش کریں، جس کے نتیجے میں سوسائٹی دنیا میں بھی ترقی کرے اور آخرت کی کامیابی بھی ہمیں ملے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان امور پر غور وفکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں سرخرو فرمائے۔ آمین!

آخر میں مَیں ایک بار پھر شعبۂ علومِ اسلامیہ بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کے کارپردازان کا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے یہاں گفتگو کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور اساتذہ اور طلبا کا بھی شکریہ کہ انھوں نے دل جمعی کے ساتھ گفتگو کو سنا۔

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین.

(نوٹ: لیکچر کے اختتام پر ناظمِ اجلاس نے صدرِ مجلس کی اجازت سے سوال و جواب کے سیشن کا آغاز کیا۔ چناں چہ اساتذہ اور طلبا نے سوالات کیے حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے ان کے جوابات دیے۔ ذیل میں اس موقع پر کیے گئے سوالات و جوابات پیش کیے جارہے ہیں۔)

سوالات و جوابات

سوال: آپ نے عدلِ اجتماعی کے حوالے سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار کی اہمیت بیان کی ہے، لیکن کچھ علما نے حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار پر اعتراضات کیے ہیں، جن میں علامہ زاہد الکوثریؒ بھی ہیں انھوں نے ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں معجزۂ شق

القمر کے انکار کے حوالے سے شاہ صاحبؒ کی رائے پر تنقید کی ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: دیکھئے! بنیادی چیز سمجھنے کی یہ ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فلاسفی ایک مکمل نظامِ فکر و عمل واضح کرتی ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ جب تک اس پورے فلسفے کو نہ سمجھا جائے تو وہ سوالات پیدا ہوتے ہیں، جو علامہ زاہد الکوثریؒ نے کیے ہیں۔ اُن کا حنفیت پر بہت ہی زیادہ تصلّب اور پختگی رہی ہے۔ اُن کی کتاب ''حُسنُ التّقاضی'' اور اُن کی دیگر کتابیں اس کی گواہ ہیں۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسلام کی جامع تعلیمات کے حوالے سے جو کچھ بیان فرما رہے ہیں، وہ اسلام کے ایک مجموعی علمی اور فکری نظام کے حوالے سے ہے۔ شاہ صاحب نے چاروں فقہی مذاہب؛ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے۔ اسی طریقے سے انھوں نے صوفیا کے چاروں سلسلوں؛ سہروردی، نقشبندی، قادری اور چشتی کے درمیان تطبیق پیدا کی۔ نیز انھوں نے تاریخی حوالے سے خلافتوں کے چار ادوار — خلافتِ راشدہ، بنواُمیہ، بنوعباس اور بنوعثمان — میں عدلِ اجتماعی کے حوالے سے سیاسی، معاشی، سماجی کردار کو سمجھنے کے بنیادی اصولوں کو مربوط طور پر پیش کیا۔ پھر اسی کے ساتھ دینِ اسلام کی ایک مکمل فلاسفی یعنی ''علمِ اسرار الدین'' قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہ کی تعلیمات کے تناظر میں پیش کی ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر جب امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس پورے وسیع دائرے میں گفتگو کرنے کے بجائے ہم کسی ایک پہلو کو لے لیتے ہیں۔ جب کسی ایک پہلو کو انفرادی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کا مکمل نظامِ فکر و عمل ہمارے سامنے نہیں ہوتا، تو پھر سوالات اُبھرتے ہیں۔ اس حوالے سے علما کا اپنا جو ذہنی پس منظر ہوتا ہے، اُس سے ہٹ کر جو بات ہوتی ہے، وہ اُسے ''تفرُّد'' کہہ کر اعتراض کر دیتے ہیں۔ اب علامہ زاہد الکوثریؒ فلسفے کے آدمی نہیں ہیں۔ فلاسفی پر اُن کا کوئی کام ہمارے سامنے نہیں ہے۔ وہ صرف ایک فقیہ ہیں اور فقیہ بھی صرف حنفیت کے ہیں۔ باقی تین مذاہب یا فقہی مکاتب سے انھیں ہمیشہ شدید اختلاف رہا ہے۔ وہ بڑے کٹر حنفی ہیں۔ اب اگر حنفیت کے دائرے سے تھوڑا سا بھی کوئی اِدھر اُدھر ہو تو اُس پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

جہاں تک آپ نے معجزۂ شق القمر کی بات کی ہے تو اس حوالے سے علامہ زاہد الکوثریؒ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بات اس تناظر میں بیان نہیں کی ہے، جس طرح سے کوثری صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ پر الزام لگایا ہے۔ یہ بحث شاہ صاحبؒ نے ''تأویل الأحادیث'' میں کی ہے۔ ''تأویل الأحادیث'' میں حضورؐ کی خصوصیات کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے اسے معجزات میں سے شمار کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر معجزۂ شق القمر کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے ''**بعض من لہٗ معرفة بعلم الأثر و حکمة الطبیعیة**'' اور علامہ ابن ماجشونؒ کے اقوال نقل کیے ہیں۔ ان اقوال کے مطابق یہ معجزہ علاماتِ قیامت میں سے ہے اور یہ اُسی طرح ظہور پذیر ہوا، جس طرح کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آیت ''يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ'' (29) کی تشریح مشرکینِ مکہ کی آنکھوں کے سامنے قحط کی وَجہ سے پیدا ہونے والے دُھوئیں سے کی ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ (30) جب کہ شاہ صاحبؒ نے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے ''**تأویل الأحادیث**'' میں لکھا ہے کہ: ''میں کہتا ہوں: میں نے یہ قول محض امکان اور احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر طرح وسیع ہے۔'' (31)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً علامہ زاہد الکوثریؒ نے شاہ صاحبؒ کی کتابیں براہِ راست نہیں پڑھی ہیں۔ عالمِ عرب کے ایک سلفی عالم نے حضرت امام ابو یوسفؒ اور حنفیت کے حوالے سے ایک کتاب تحریر کی، اُس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کچھ عبارتیں اپنی

تائید میں بیان کیں۔ اس سلفی عالم کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے علامہ زاہدالکوثریؒ نے یہ گفتگو کی ہے۔

اسی طرح انھوں نے عالمِ مثال کے حوالے سے بھی شاہ صاحبؒ پر تنقید کی ہے، یہ اعتراض بھی دراصل شاہ صاحبؒ کے مجموعی فکر وعمل کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہر شعبے کے علمی ماہرین کا جن امور پر اتفاق رہا ہو، انھیں اسی تناظر میں سمجھا جائے۔ صوفیائے کرامؒ کا عالمِ مثال پر اجماع رہا ہے۔ علم تصوف ایک مستقل شعبۂ دین ہے، وہ ایک مستقل فن ہے۔ فقہ ایک مستقل علم وفن ہے۔ ایسے ہی سیاسیات وخلافت سے متعلق علم بھی ایک مستقل فن ہے۔ پھر سیاست اور معیشت الگ الگ علوم ہیں، تو ان علوم کو اگر انفرادی طور پر دیکھیں گے تو سوالات اُبھریں گے۔ عالمِ مثال پر شاہ صاحبؒ نے ''**حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه**'' میں مستقل ایک باب باندھا ہے اور اس سلسلے میں ستر احادیث پیش کی ہیں۔ کہ اگر آپ عالمِ مثال نہیں مانتے تو ان ستر احادیث کی بغیر کسی تاویل کے صحیح تشریح نہیں ہوسکتی۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے اپنی وقیع کتاب ''**عبقات**'' میں لکھا ہے کہ:

''حق بات یہ ہے کہ عالمِ مثال کا انکار کرنے والا اہلِ سنت میں سے نہیں ہے، بلکہ اُس میں معتزلہ کے خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اُسے ایک ہزار بلکہ اُس سے بھی زائد نصوصِ شرعیہ کی تاویلِ بعید کرنی پڑے گی۔''(32)

سوال: حضرت! بات یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے جو ابھی آپ نے افکار بیان کیے ہیں، یہ اُس دور میں تھے کہ جب ابھی برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس دور میں اگرچہ استعماری قوتیں اس حکومت کو کمزور کر رہی تھیں، لیکن ابھی تک ان قوتوں کا غلبہ نہیں قائم ہوا تھا۔ اب جب کہ ہم مکمل طور پر مغلوب قوم کی حیثیت میں ہیں، اور دوسروں کی ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں، تو پھر ہم اس شکنجے سے کیسے نکلیں؟ اور شاہ صاحبؒ کے اس فلسفے کو جو عدلِ اجتماعی پر مبنی ہے، کیسے ہم اپنی سوسائٹی میں نافذ کر پائیں گے؟ ایک نظام وہ ہے، جو ویسٹرن ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی عوام کے اندر خیر وفلاح لے کر آئے ہیں۔ دوسرا رشین ہیں، وہ بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ اس خطے کے اندر اس نے کچھ نہ کچھ اپنے عوام کے لیے کام کیے ہیں، لیکن ہم ہر جگہ بدحالی کا شکار ہیں۔ جن ممالک کے پاس وسائل ہیں، وہاں بھی ہمیں کچھ ایسا نظر نہیں آتا ہے کہ وہ اپنے دائرے سے نکل کر ان وسائل کو دیگر مسلمانوں تک پہنچانے کی کوئی سوچ یا حکمتِ عملی رکھتے ہوں۔ تو کیوں کر یہ نظام ہم لاگو کر پائیں گے؟

جواب: دیکھیے! میں آپ کی گفتگو میں مزید اضافہ کروں گا کہ مسلمان ممالک اپنے وسائل اپنے ملک کے لوگوں پر خرچ کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ دیگر ملکوں کو تو وہ بعد میں دیں گے۔ پہلے تو انھیں اپنے ملک کے عوام یا اُن کے مسائل کے حل کرنے کے لیے بھی ان وسائل کو خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی سے ہماری آزادی کی حیثیت معلوم ہوجاتی ہے۔

دیکھیے! پہلے ایک بنیادی بات ہمیں جاننی ہے کہ ہم شکست خوردہ ہوچکے ہیں۔ ہمارا پُرانا نظام ٹوٹ چکا ہے۔ بین الاقوامی غلبہ سامراجی ظالم طاقتوں کا ہے۔ اپنے ملکوں کے لیے انھوں نے کتنے ہی اچھے کام کیے ہوں، لیکن مسلمان معاشروں میں یا دنیا کے مظلوم خطوں پر اُن کا تسلط ظالمانہ اور غاصبانہ ہے۔ اب ایسی حالت میں دو ردِّعمل ہیں: ایک یہ ہے کہ ہم اشتعال میں آئیں، ہتھیار اٹھائیں، تشدد کا راستہ اپنائیں، خود اپنے آپ کو بھی ماریں، دوسروں کو بھی ماریں۔ جب کہ دوسرا ردِّعمل یہ ہے کہ ہم مکمل طور پر اُن کے سامنے سپردگی اختیار کرلیں کہ آپ جو ہمارے ساتھ غلامی کا سلوک حکمران کی حیثیت سے کریں، ہمیں تسلیم ہے۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دونوں انتہا پسندانہ پہلو ہیں۔ اپنے آپ کو مکمل سرنڈر کردینا اور کسی بھی قسم کی فکر وعمل کی تحریک پیدا

نہ کرنا' یہ پہلو خطرناک ہے، قومی تباہی و بربادی کا سبب ہے، دینِ اسلام کی تعلیمات سے قطعی متصادم ہے۔ دوسرا راستہ کہ بغیر سوچے سمجھے تشدد، قتل و غارت گری یا جہاد کے نام پر گردنیں اُڑانے، لڑائی، دنگا فساد پیدا کرنے کا کام شروع کر دیا جائے۔ اس کے لیے نہ کوئی تیاری ہو، نہ کوئی بیک گراؤنڈ ہو، نہ کوئی عمل ہو۔ متوازن سوچ یہ ہے کہ اس پورے ماحول اور معاشرے کے حقائق کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دین کی جو اوریجنل تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں، انھیں پیش نظر رکھا جائے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس دور کے صاحبِ زمان ہیں۔ انھوں نے دین کی جامع تعلیمات پیش کی ہیں۔ ان کی روشنی میں ایک شعوری تحریک آگے بڑھے۔ فکر و عمل اور سوچ کا صحیح زاویہ نظر آگے بڑھائیں۔ آج یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو علمی بنیادیں یہ یورپین سسٹم ہمارے سامنے رکھ رہا ہے، اس کے متبادل ہماری علمی بنیادیں کیا ہیں؟ ہم کیا نظریاتی بنیاد رکھتے ہیں؟ کیا ہمارے پاس کوئی مستقل سیاسی نظام، ایک معاشی سسٹم، ایک سماجی سسٹم موجود ہے، جو علمی، فکری، دعوتی نقطہ نظر سے ہم انسانیت کے سامنے رکھیں؟

دوسری بات یہ کہ خود یورپ نے جنگِ عظیم دوم کے بعد سے اقوامِ متحدہ بنا کر کچھ بنیادی اساسی اصول پوری انسانیت کے نقطہ نظر سے تسلیم کیے ہوئے ہیں، خواہ دکھاوے کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ بنیادی انسانی حقوق ہیں اور اس کی روشنی میں قومی ریاستیں قائم ہوئی ہیں۔ اس لیے ہر قوم کو اپنا ریاستی اور قومی نظام بنانے کا حق ہے کہ وہ اپنا سیاسی، معاشی، سماجی نظام، اپنی قومی اُمنگوں اور ملّی تقاضوں کے مطابق قائم کریں۔ تو جیسے رشین نسل کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے نظریے پر اپنا قومی نظام بنائے۔ امریکی نسل کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی فکر پر اپنا نظام بنائے۔ ایسے ہی مسلم ممالک کے عوام کا بھی قانونی آئینی حق ہے کہ وہ جس مذہب سے وابستہ ہیں، اس کے مطابق اپنا سیاسی معاشی سماجی نظام قائم کریں۔ اس نظام کی علمی بنیادیں ہوں گی تو ہم یہ کام کر پائیں گے۔ اور اگر علمی بنیادیں نہیں ہوں گی تو ہمارے افکار منتشر رہیں گے۔ مثلاً سیاست کا معاملہ آتا ہے تو سیاست میں ہم ابھی تک یہی بحث کر رہے ہیں کہ آیا اسلام میں جمہوریت ہے یا خلافت؟ اور خلافت کی تشریح کیا ہے؟ اس پر بھی کوئی اتفاق نہیں ہے کہ شخصی حکومت یا بادشاہت یا سلطنت ہونی چاہیے، کوئی ''سماحۃ الشیخ'' ہم پر مسلط ہو؟ یا کوئی پرائم منسٹر اور صدر ہمارا حکمران ہو؟ اس کے بارے میں ہم ابھی تک یکسو نہیں ہوئے۔ اسی طریقے سے معاشی نظام کی بات آتی ہے تو اس میں مختلف افکار و نظریات یا تضادات موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ کم از کم ہمارے ملک کے علمی حلقے جو شعوری اور عقلی بنیادوں پر چیزوں پر غور و فکر کرتے ہیں، ہمارے تعلیمی ادارے ہیں، ہمارے اہلِ علم ہیں، ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ہے، وہ یہ غور و فکر کرے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات یا بہ الفاظِ دیگر دین کی تعلیمات کی روشنی میں ہماری بنیادی اقدار کیا ہیں؟ ہمارا بنیادی فکر کیا ہے؟ ہمارا بنیادی نظریہ کیا ہے؟ اور اس کو عمل میں لانے کا طریقۂ کار اور سسٹم کیا ہے؟ دین نے اس کے حوالے سے ہماری کیا رہنمائی کی ہے؟ اس پر غور و فکر کرنا، مکالمہ کرنا، شعوری تحریک چلانا، یہ ہمارا آئینی حق بھی ہے، قانونی حق بھی ہے اور بین الاقوامی قوانین کے تحت بھی اور ملک کے آئین کے تحت بھی مسلمہ ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ تحریک جب آگے بڑھتی ہے تو سب سے پہلے شعوری عمل ہوتا ہے۔ اگر شعوری اور نظریاتی و فکری بنیاد نہ ہو اور صرف شور شرابا مچائیں، امریکا یا روس اور ان ملکوں کے نظاموں کو بُرا بھلا کہنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ علمی بنیادیں فراہم کرنا اس دور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں چاہے وقتی طور پر کامیابی نہ بھی ہو، لیکن یہ علم کی شمع، یہ روشنی، یہ عقل و خرد کی تعلیم دینِ

www.rahimia.org

اسلام کی تعلیمات کی اساس پر ہے، اس کو فروغ دینا، اس کو آگے بڑھانا' وقت کی ضرورت اور تقاضا بھی ہے۔ جیسے جیسے یہ تحریک آگے بڑھے گی، نظریہ پھیلے گا، ہماری بنیادیں مستحکم ہوں گی، علمی طور پر ہم اپنی بات منوائیں گے تو نتیجتاً اگلے مرحلے میں اگلے عمل بھی وجود میں آئیں گے۔ لیکن سرنڈر ہوکر بیٹھ جائیں، جو کچھ یورپ نے کہا ہے، اسی کی جگالی کرنے لگیں۔ ہماری یونیورسٹیز پولیٹکل سائنس میں یورپ کی سیاست پڑھائیں، سوشیالوجی میں امریکا اور برطانیہ کی سوسائٹی پڑھائیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

ابھی میں سوات گیا تھا۔ وہاں سوات یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے طلبا سے مَیں نے پوچھا کہ آپ کو کیا پڑھا رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ جی امریکا، برطانیہ، فرانس کی سوسائٹی کی ترقیات پڑھا رہے ہیں۔ میں نے کہا: آپ کے سوات کی تہذیب دو ڈھائی تین ہزار سال کی ہے، یہاں بھی تو کوئی سوسائٹی رہی ہے۔ کم از کم بہ طور ہسٹری کے اپنی سوسائٹی کے بارے میں تمھیں کچھ معلومات ہیں؟ کہتے نہیں جی، جو ہمارے پروفیسر ڈاکٹر ہیں، وہ امریکا سے پی ایچ ڈی کرکے آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہاں کی تو کوئی تہذیب ہی نہیں تھی۔ یہاں کا تو کوئی سماج ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ: پھر تم لوگ سوچو کہ اس دھرتی پر بسنے والے لوگوں کی تم اولاد نہیں ہو؟ صدیوں سے آپ کے آباؤ اجداد اس دھرتی پر بستے چلے آرہے ہیں۔ کیا انھوں نے کوئی سماجی ڈھانچہ قائم نہیں کیا تھا؟ کیا مسلم دور سے پہلے ایک ہزار سال تک یہاں اشوکِ اعظم جیسے لوگوں نے یہاں کی سوسائٹی کی صورت گری نہیں کی تھی؟ مسلم دور کے ہزار سالہ دور میں محمد بن قاسم سے لے کر اورنگزیب عالمگیر تک یہاں کوئی سماج نہیں تھا؟

ہمیں اپنی قومی تاریخ اور اپنی دھرتی سے کاٹ کر صرف امریکا برطانیہ کی ترقیات پڑھانے سے تو سوشیالوجی نہیں آئے گی۔ سوسائٹی اور دھرتی کے تقاضوں کو سمجھے بغیر ہم کیسے آگے بڑھ پائیں گے؟ ایسے ہی جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ہم اسلام کا وہ تناظر پیش کرتے ہیں، جو اس دھرتی سے کٹ کر، یہاں سے الگ ہوکر ہے۔ جب تصوراتی اور رومانوی بنیادوں پر کسی چیز کو پڑھایا جاتا ہے تو اس کے اثرات عملی طور پر نظر نہیں آتے۔ آج ہمیں ان حقائق کو تسلیم کرکے، قومی اور ملّی تقاضوں کے شعور کے تناظر میں ان امور پر بحث کرنے کی اور گفتگو اور مکالمے کی ضرورت ہے۔

سوال: شاہ صاحب کے جو معاشی افکار ہیں، یہ کمیونزم والے ہیں یا کمیونزم والوں نے شاہ صاحب سے لیے ہیں؟

جواب: شاہ صاحبؒ تو سوشلزم اور کمیونزم سے بہت پہلے کے آدمی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے 1746ء میں ''**حُـجّةُ الـلّٰـه البـالِغـه**'' لکھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بانی ایڈم سمتھ کی کتاب دولتِ اقوام 1776ء میں چھپی اور 1799ء میں اُس پر سرمایہ داری نظام قائم ہوا ہے۔ اسی طرح کارل مارکس نے 1857ء کے بعد ''داس کیپٹل'' لکھی ہے اور اس کا کمیونسٹ مینی فیسٹو 1866ء میں چھپا ہے۔ ایسی صورت میں شاہ صاحبؒ کے معاشی افکار کا کمیونزم سے اخذ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال: شاہ صاحبؒ کے فکر کی بنیادی خصوصیت کیا ہے، جسے آج کے صنعتی دور کے پیراڈائم میں بھی پیشِ نظر رکھا جاسکے؟ شاہ صاحبؒ کے فکر کو تین چار سو سال گزر چکے ہیں، اس دور میں وہ کیسے قابلِ عمل ہوسکتا ہے؟

جواب: شاہ صاحبؒ کے فکر کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے قرآن و حدیث اور خلفائے راشدینؓ کی جدوجہد سے وہ آفاقی اصول اخذ کیے ہیں، جن کی روشنی میں کسی تجارتی یا زرعی یا صنعتی دور کا عملی سسٹم بنایا جاتا ہے۔ یعنی انھوں نے تجریدی عمل کرکے بنیادی قانون اور اُس کی عملی شکل کے درمیان فرق و امتیاز واضح کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی سماج میں ایک بنیادی آئین اور

دستور ہوتا ہے، پھر اس پر بائی لاز بنا کر ایک عملی سسٹم وجود میں لایا جاتا ہے۔ بنیادی اصولوں پر قوانین اور پالیسیز بنتی ہیں، اس کے پروسیجرز بنتے ہیں۔ اب ہوا یہ کہ جب زرعی دور تھا، اس دور کے تقاضوں کے مطابق دین کی آفاقی تعلیمات کا عملی نظام بنایا گیا۔ اب جیسے ہی اگلا دور شروع ہو تو اگر آپ زرعی دور کے اُن بائی لاز کو بھی اٹھا کر اگلے دور میں لے آئیں تو تضادات پیدا ہوں گے نا۔

ظاہر ہے کہ جب ایک نیا زمانہ آتا ہے تو اس کے نئے تقاضے ہوتے ہیں۔ مجدد آ کر یہ کام کرتا ہے کہ دین کی تعلیمات کے جو آفاقی اصول ہیں، انھیں سامنے رکھ کر صاف شفاف طور پر واضح کرتا ہے۔ پھر اُن کی روشنی میں اپنے دور کے جو نئے سیاسی، سماجی، معاشی تقاضے وجود میں آتے ہیں، ان کے سسٹم بنائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے فکر میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ انھوں نے دین کی اساس پر انسانی معاشروں کی اجتماعی تشکیل کے بنیادی آفاقی اصول متعین کر دیے۔ اب جو اُس دور میں اگر تجارتی دور تھا تو اس کے عملی نظام بنائے گئے تھے۔ اب اگر آج آپ نئے صنعتی دور میں داخل ہوئے ہیں، بلکہ اب تو ڈیجیٹل ایج (دور) آ گیا ہے، اس کے اگلے دور میں کوئی نئے پیداواری رشتے اور نیا کوئی زمانہ آ جائے تو اب انھی آفاقی اصولوں کی روشنی میں عملی نظام کے نئے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا تا کہ عدلِ اجتماعی کا بہتر نظام قائم کیا جا سکے۔

سوال: شاہ صاحبؒ پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے عمومی طور پر ایک سوال کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو یہاں پر بلایا ہے، اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کے ساتھ کیا کیا ہے، ہندوستان کے اجتماع اور معاشرے کو سمجھنے میں شاہ صاحبؒ کو تسامح ہوا ہے کہ وہ اگر اس چیز کو جانتے کہ احمد شاہ ابدالی یہ کرے گا یا افغان جو آئے ہیں، انھوں نے اس خطے کے لیے کیا کیا ہے ماضی میں، تو شاید شاہ صاحبؒ اس طرح کے خطوط نہ لکھتے۔ اس حوالے سے آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: دیکھئے! بنیادی بات یہ ہے کہ یہ اعتراض کرنے والے دو پہلوؤں سے یہ بات کرتے ہیں: ایک تو یہاں کے قوم پرست اعتراض کرتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ نے ہندوستان پر ایک باہر کی قوم کے آدمی کو دعوت دی کہ یہاں پر حملہ کرے اور کابل سے آئے اور یہاں کی قومیتوں کو نقصان پہنچائے۔ یہ پہلو تو سرے سے غلط اس لیے ہے کہ کابل ہمیشہ سے ہندوستان کا ایک صوبہ رہا ہے۔ اورنگزیب کے زمانے میں بھی کابل ہندوستان کا صوبہ تھا، جیسے بنگال ایک صوبہ تھا۔ تو کسی ایک صوبے دار کو مرکز کے اندر بلانا یا اُس کو دعوت دینا، اس کو قومیت کے دائرے سے باہر سمجھنا درست نہیں۔ ہندوستان کے اس وقت کی جو جغرافیائی حدود تھی، یا اس کے صوبہ جات کی جو تقسیم تھی، اس تناظر میں اس کو غیر ملکی حملہ آور قرار دینا اور اُسے انگریزوں کے مشابہ قرار دینا قطعی طور پر غلط ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کا ایک کام مرہٹوں کے اقتدار اور اُن کی طاقت کو توڑنا ہے۔ مرہٹے کون تھے؟ یا مرہٹوں کا کیا کردار تھا؟ تاریخ نے اس کو محفوظ رکھا ہوا ہے کہ مرہٹہ خود ہندوؤں کے لیے بھی مصیبت کا باعث تھے۔ انھوں نے ہندو عورتوں کے ساتھ بھی جو سلوک کیا، وہ بہت بُرا تھا۔ انھوں نے سوسائٹی میں انارکی پیدا کی، سسٹم کو توڑا اور انسانیت پر مظالم ڈھائے، اب اُس کے علاج معالجے کی شکل کیا تھی؟ شاہ صاحبؒ نے اسی حوالے سے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس نے مرہٹہ طاقت کو توڑا ہے۔ اور مرہٹہ طاقت کو توڑنے کے بعد اگر وہ دہلی میں داخل ہوتا ہے اور مرہٹوں کے جو اثرات وہاں پر ہیں، اس کے خاتمے کے لیے جب ایسا کوئی سیاسی عمل یا لڑائی کا عمل ہوتا ہے تو یقیناً اونچ نیچ ہوتی ہے، مسائل ہوتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں نا کہ گیہوں پیسا جاتا ہے تو گھن بھی ساتھ ہی پس جاتا ہے۔ تو ضرور زیادتیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں،

www.rahimia.org

لیکن بہ حیثیتِ مجموعی تاریخ پر نظر دوڑائیں کہ اگر مرہٹہ طاقت غالب آجاتی تو اس وقت ہندوستان کا منظرنامہ کیا ہوتا؟ اُن کی اجتماعیت سے عاری انفرادیت کی سوچ، سوسائٹی کے بنیادی تقاضوں سے ناآشنا، خود اپنی ہندونسل کے لیے بھی اُن کا انسانیت دشمنی کا کردار اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُن کی طاقت کو توڑا جائے۔ احمد شاہ ابدالی کی وَجہ سے ایسی منفی سوچ رکھنے والوں کے خاتمے سے ہندوستان کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: لوگ کہتے ہیں کہ مرہٹوں کی طاقت توڑنے کے نتیجے میں انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ پھر شاہ صاحبؒ ایک طرف "**فَکُّ کُلِّ نِظَام**" کی بنیاد پر ایک نئے نظامِ فکر وعمل کی دعوت دے رہے ہیں اور دوسری طرف اسی نظام سے وابستہ افراد کے ذریعے سے دہلی کو بچانے کے لیے خطوط لکھ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: اس بات کا تعین کرنا بڑا ضروری ہے کہ کیا مرہٹہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے والی طاقت تھی یا مرہٹہ طاقت انگریزوں کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ تاریخ کا بہت بڑا دورانیہ ہے، جس میں خود مرہٹہ طاقت کی انگریزوں کے ساتھ صلح ہے، معاملات طے پائے ہیں اُن کے۔ سیاسی گیم میں مسلمانوں کے بھی اور مرہٹوں کے بھی کچھ طبقے کبھی اِدھر رہے اور کبھی اُدھر ہوتے رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دہلی کے مرکز اور ہندوستان کے وفاق کو بچانا تھا۔ شاہ صاحبؒ کا احمد شاہ ابدالی کے نام جو خط ہے، اس کو اگر آپ پڑھیں تو اس میں تفصیل سے شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے تمام صوبوں کے ریونیو کا ذکر کیا ہے کہ کس صوبے سے کتنا ریونیو آتا تھا۔ ان انگریزوں اور مرہٹوں کی وَجہ سے کس کس صوبے سے ریونیو آنے میں کتنی کمی ہوئی۔ خالصہ کی رقم میں کس قدر کمی ہوئی۔ اس خط میں شاہ صاحبؒ نے اس دور کے مالیاتی اور سیاسی ڈھانچے پر بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ اس خط میں دو پہلو ہمارے سامنے لائے ہیں: ایک سیاسی اور دوسرا معاشی۔ انھوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ انگریزوں اور مرہٹوں کی آپس کی لڑائی یا باہمی اتحاد یا خود مسلمان راجاؤں اور نوابوں کے باہمی جھگڑوں اور طوائف الملو کی کے نتیجے میں کون کون سے مسائل پیدا ہوئے۔ معاشی طور پر ریونیو کی صورتِ حال کیا تھی۔ وفاق کا کنٹرول کمزور پڑ گیا۔ اسی طریقے سے سیاسی طاقت کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اور اس میں نواب نجیب الدولہ کو اور احمد شاہ ابدالی کو اس وفاق کو مضبوط کرنے کے نقطۂ نظر سے ہی دعوت دی گئی۔

دیکھیں! معروضی حالات کے تناظر میں ہی رائے قائم کی جاتی ہے۔ جب کوئی آدمی میدانِ عمل میں ہوتا ہے، وہاں اس وقت دستیاب حالات میں جو بھی ممکنہ طور پر بہتری کی شکل ہوتی ہے، اسی کو تجویز کیا جاتا ہے۔ اس دور کے تمام صوبہ جات کے گورنروں کی حالت کیا تھی؟ سیاسی طاقت کیا تھی؟ معاشی قوت کیا تھی؟ مجموعی طور پر وہ کیا کردار ادا کرنے کے قابل تھے؟ شاہ صاحبؒ نے اسی خط میں لکھا ہے کہ بنگال جہاں سے سب سے بڑا ریونیو آتا تھا، اس کا گورنر ایک سولہ سترہ سال کا نوجوان (سراج الدولہ) لگا دیا ہے، جس کو نہ کوئی سیاسی عقل ہے، نہ جنگ لڑنے کی کوئی بات ہے۔ افراد کو سمجھنے کی بھی اس میں اہلیت نہیں ہے۔ اور خطرہ یہ ہے کہ اگر اس کی نوابی یا اس کی گورنری برقرار رہی تو اس کے نتیجے میں بنگال مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہی ہوا۔ تو دستیاب صورتِ حال میں احمد شاہ ابدالی کو بلانے کا اقدام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔

اسی طرح یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ شاہ صاحبؒ کے کام کی دو نوعیتیں تھیں: ایک تو انھوں نے مستقبل میں ایک مثالی نظام کے بنیادی امور، نظریات، افکار، تعلیمات پیش کیں۔ یہ تو لانگ ٹرم حکمتِ عملی تھی۔ اور ایک شارٹ ٹرم حکمتِ عملی کہ اس وقت جو زوال

ہے، اس کو روکنے کے لیے کیا اقدام کیا جائے۔ اور اس وقت جو ممکنہ طور پر سیاسی، اقتصادی اور معاشی طاقت رکھنے والے لوگ ہیں، اُن میں ممکنہ طور پر ایک بہتر صورتِ حال پیدا کرنے کے لیے کیا اقدام کیا جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ احمد شاہ ابدالی کب آیا اور انگریزوں کا دہلی پر تسلط کب ہوا؟ اس میں بیس تیس سال کا فرق ہے۔ 1761ء میں پانی پت کی جنگ ہوئی اور مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے 1803ء میں دہلی فتح کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا دورانیہ ہے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سی طاقتیں تھیں، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی؟ تاریخی حقائق کے تناظر میں بات ہونی چاہیے۔ احمد شاہ ابدالی کے نام شاہ صاحبؒ کا پورا خط پڑھنا چاہیے۔ ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' میں ان خطوط کا فارسی متن اور اردو ترجمہ دونوں چھپے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ القرآن: 25:57۔ 2۔ القرآن: 9:61۔ 3۔ صحیح بخاری. باب ما ذکر عن بنی إسرائیل. حدیث 3455، طبع بیروت

4۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب 53، حدیث نمبر 4950

5۔ صحیح بخاری. باب ما ذکر عن بنی إسرائیل. حدیث نمبر 3455، طبع بیروت۔

6۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب 53، حدیث نمبر 4950

7۔ البدایہ و النھایہ، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر قرشی بصری ثم دمشقی، ص 292، ج 2، طبع: دارالفکر، بیروت، لبنان، 1986ء۔

8۔ صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب بدء الوحی، حدیث نمبر 3. 9۔ القرآن: 7:93۔ 10۔ القرآن: 1:96۔

11۔ القرآن: 6:96۔ 12۔ القرآن: 17:79۔ 13۔ القرآن: 4:28۔ 14۔ القرآن: 15:73۔

15۔ القرآن: 15:96۔ 16۔ القرآن: 16:96۔ 17۔ القرآن: 17:96۔ 18۔ القرآن: 18:96۔

19۔ القرآن: 9:96۔ 20۔ القرآن: 4:61۔

21۔ السیرة النبویة لابن ھشام، ص 144، جلد دوم، الطبعۃ الثالثۃ، مکتبہ دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان۔

22۔ سنن ترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللہ ﷺ، باب 2، حدیث 2159۔

23۔ القرآن: 112:16۔ 24۔ القرآن: 256:2۔

25۔ جیسا کہ سورت النساء کی آیات نمبر 60 سے 65 تک کے ذیل میں مفسرین نے اس واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔

26۔ حجة الله البالغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مبحث الارتفاقات، باب الرسوم السائرة فی النّاس، ج: 1، ص: 151، طبع دیوبند۔

27۔ البدور البازغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص: 87، طبع شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔

28۔ ایضاً، ص: 94۔ 29۔ القرآن 10:44۔ 30۔ صحیح بخاری، ص 714، ج 2۔

31۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے: ''و قُلتُ: و ھٰذا القول ذکرتُہٗ علٰی سبیل الإمکان و الاحتمال، و إلاَّ فقُدرة اللّٰه تعالٰی تسع الکُلّ.'' تاویل الأحادیث، ص 104، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔

32۔ ''الجاحد للوُجود المثالی لیس من أھل السّنّة حقّاً، بل فیه شوب من الاعتزال لما أنّهٗ یضطرّ إلٰی ألف نصّ بل اکثر تاویلاً بعیداً.'' عبقات، خاتمة الکتاب فی تحقیق عالم المثال، عبقه نمبر 7، طبع: مجلس علمی، کراچی

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ حالاتِ نو آبادیات

نوآبادیاتی ریلویز: برطانوی سامراج کا معاشی پہیہ

تحریر: محمد اکمل سومرو

خلاصہ (Abstract)

(ہندوستان پر برطانوی سامراج کا تسلط 200 سال تک رہا۔ یہ عہد ہندوستان کی غلامی کا ہے، جس میں برطانوی استعماری پالیسیوں نے ہندوستان کے وسائل کو بے دردی سے لوٹا اوران وسائل کو یورپ منتقل کیا گیا۔تصور کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ریلویز کا وسیع وعریض اور جدید نیٹ ورک کا نظام برطانیہ کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ بلاشبہ یہ ریلویز ہندوستان میں نقل وحمل کا اہم ذریعہ رہا ہے، تاہم نوآبادکاروں نے ریلویز کا یہ نظام عوامی مفادات کو مدِنظر رکھ کرنہیں بنایا تھا، بلکہ کالونیل مفادات کے پیش نظر ریلوے لائنز بچھائی گئی تھیں۔ اس ریسرچ آرٹیکل میں ہندوستان میں ریلویز کی تعمیر کے لیے برطانیہ کے تزویراتی ومعاشی مفادات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہندوستان میں ریلویز کی تعمیر کا کام1850ء میں شروع ہوا اور1924ء تک یورپ کی کمپنیوں کو ریلوے ٹریک کی تعمیر کے ٹھیکے دیے گئے تھے اورٹھیکوں کے عوض کمپنیوں کو سرمایہ کاری پر پانچ فی صد ضمانت دی گئی تھی، جب کہ ان ٹھیکوں کے ساتھ کمپنیوں کو99 سال کے لیے مفت زمین فراہم کی گئی اور ضمانت کے مطابق آمدن نہ ہونے پر ہندوستانی خزانے سے لاکھوں پاؤنڈز جرمانہ بھی کمپنیوں کو ادا کیا گیا۔

ریلوے کی تعمیر کا بنیادی مقصد ہندوستان سے کپاس، پٹ سن، لوہا، معدنیات وغیرہ کی یورپی ممالک میں برآمدات کو تیز کرنا تھا، جب کہ تزویراتی نقطۂ نظر کے تحت فوجی اسلحہ و ساز و سامان بھی ریلوے کے ذریعے سے فوجی چھاؤنیوں تک منتقل کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ ریلوے ٹریک کی تعمیر ہی فوجی چھاؤنیوں کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی رہی۔ برطانوی نوآبادیاتی پالیسی کے تحت ریلویز پر یورپ کی کمپنیوں نے بھاری منافع کے عوض سرمایہ کاری کی لیکن برطانوی تسلط کے اس دوسوسالہ دور میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کی شرح ۲۵ فی صد سے کم ہوکر ۲ فی صد تک گرگئی۔ ہندوستان پر قابض برطانوی استعمار نے ریلویز تعمیر کرنے والی کمپنیوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدات کیے، وہ یک طرفہ تھے۔ ان معاہدات کے ذریعے سے سرمایہ دارانہ معیشت کی حامل کمپنیوں کو ہندوستان کے خزانے سے مالی فوائد دیے گئے۔

مذکورہ تحقیق اس بات کی بھی عکاسی کرتی ہے کہ ہندوستان کا ریلوے نیٹ ورک حکومت نے نجی کمپنیوں کے ذریعے سے تعمیر کرایا اور ان کمپنیوں میں یورپ کے سرمایہ کار اور نوآبادیاتی فوج کے ریٹائرڈ افسران شامل تھے، جو

www.rahimia.org

لندن میں قائم سیکرٹری آف سٹیٹ آف انڈیا پر کنٹرول رکھتے تھے۔ یہ کمپنیاں اتنی طاقت ور تھیں کہ حکومتِ ہند نے جب بھی معاہدات کی خلاف ورزی کی شکایت کرنے یا معاہدہ ختم کرنے کی کوشش کی تو سیکرٹری آف سٹیٹ نے ہی ہندوستان کے گورنر جنرل کے فیصلوں کو مسترد کر دیا۔ دوسری جانب ہندوستان میں بچھائی جانے والی ریلویز کی تعمیراتی لاگت امریکا و یورپ کے مقابلے پر فی میل ۱۵۰۰۰ پاؤنڈز زیادہ تھی۔)

نو آبادیاتی عہد میں ریلوے

برِعظیم کی تاریخ میں گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ 1001 عیسوی کا آغاز ہندوستان میں محمود غزنوی اور اُس کے خاندان کی حکمرانی سے ہوا۔ ہندوستان کی اس ہزار سالہ تاریخ میں غزنوی، لودھی، تُغلق، مُغل خاندانوں کی حکومتیں آئیں۔ ان تمام حکمرانوں نے اس خطے کو اپنا وطن بنایا، یہاں کے وسائل یہیں پر خرچ کیے، وہ اسی مٹی میں مرے اور اسی میں دفن ہوئے۔ پھر آخر میں برطانوی راج قائم ہوا، جس کا انجام ہندوستان کی تقسیم پر ہوا۔ انگریزوں نے کبھی اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھا۔ برطانوی استعماری تسلط کا دو سو سالہ عہد ہندوستان میں معاشی لوٹ کھسوٹ، سیاسی بدامنی، مذہبی گروہیت کی جڑیں مضبوط کرنے میں گزرا۔ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی نو آبادیاتی عہد کے اثرات باقی ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی سامراج نے فوجی قوت اور معاشی منصوبہ بندی کے تحت اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ بنگال سے شروع ہونے والی قبضوں کی لڑائی 1849ء میں پنجاب پر قبضے کی صورت میں ختم ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پر قبضہ 1857ء تک رہا۔ 1793ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے لینڈ ریونیو کی پالیسی نافذ کی جس کے تحت کمپنی کو زمین سے حاصل ہونے والی آمدن کو انتظامی یا پبلک ویلفیئر کے منصوبوں پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی تاہم یہ آمدن کمپنی کے لیے منافع تصور کی جاتی تھی۔ لارڈ کارنوالس نے 34,00,000 پاؤنڈز لینڈ ریونیو کی مد میں فکس کر دیے تھے۔ چناں چہ لینڈ ریونیو ہندوستان کی دولت کی لوٹ مار کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ کمپنی نے بنگال، بہار، اُڑیسہ میں دیوانی کے اختیارات حاصل کر کے اپنے لینڈ ریونیو میں مسلسل اضافہ کیا اور کسانوں کا براہ راست استحصال کر کے دولت کی لوٹ مار کی۔ (1)

ہندوستان کے وسائل کو ہڑپ کرنے کے لیے سمندری راستوں کے ذریعے سے تجارت پر کئی گنا اخراجات کیے گئے۔ کلکتہ سے پشاور تک بذریعہ جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) (2) تجارت انتہائی مہنگی تھی۔ چناں چہ نو آبادیاتی عہد میں ہندوستان پر تجارتی کنٹرول رکھنے اور تجارت کے نام پر معاشی استحصالی سسٹم کو موثر بنانے میں ریلوے نظام کا استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں امپیریل ریلوے کے پھیلاؤ کا عہد 1850ء سے لے کر 1947ء تک جاری رہا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے لیے دولت اور خام مال کی صورت میں ایندھن کی فراہمی ہندوستان سے لی جاتی رہی۔ یہ ایندھن کپاس، گندم، معدنیات، دھاتیں اور خام لوہے کی صورت میں بذریعہ ریل برطانیہ اور دیگر یورپی ملکوں میں منتقل ہوتا رہا۔ برطانیہ میں لوکوموٹو انجن کی ایجاد 1804ء میں ہوئی تھی تاہم پہلی ریل گاڑی 1825ء میں چلائی گئی اور 28 سال بعد ہندوستان میں بھی پہلی ریل گاڑی چلا دی گئی۔ (3)

www.rahnuma.org

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں ریلوے

ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر کے لیے سب سے پہلی تجویز پی اینڈ او سٹیم نیویگیشن کمپنی کے نمائندے Rowland Macdonald Stephenson نے دی تھی۔ رولینڈ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ریلوے کی معاشی افادیت پر بریفنگ دی تھی۔ اس کمپنی نے 1845ء میں تجرباتی بنیادوں پر کلکتہ سے الٰہ آباد تک 140 میل لمبی ریلوے پٹری بچھانے کی پیش کش کی اور کمپنی نے سرمائے پر تین فی صد گارنٹی طلب کی تھی۔ دوسری جانب ریلوے کے حامی دیگر سرمایہ داروں نے لندن میں اپنی کمپنیاں بنانا شروع کیں اور ریلوے کی تعمیر کے لیے مختلف تجاویز ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز میں جمع کرائی گئیں۔ چناں چہ 1845ء میں کورٹ آف ڈائیریکٹرز نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو ریلوے کی تعمیر سے متعلق مراسلہ جاری کیا۔ ریلوے کی تعمیر کا جائزہ لینے کے لیے انجینئر مسٹر سمز کو ستمبر 1845ء میں برطانیہ سے ہندوستان بھیجا گیا۔ مسٹر سمز نے 6/فروری 1846ء کو اپنی رپورٹ ارسال کی۔ اس رپورٹ میں درجِ ذیل امور کی سفارش کی گئی کہ:

1۔ ہندوستان میں ریل ہر صورت تعمیر کی جانی چاہیے، تاہم اس کے لیے حکومتِ ہند مفت زمین فراہم کرے۔
2۔ 99 سال کی لیز پر یہ زمین ریلوے کمپنی کی ملکیت رہے۔
3۔ کمپنیوں کو ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔
4۔ ریلوے ملازمین پر کمپنیوں کو مکمل کنٹرول حاصل رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور لندن کی کمپنیوں کے درمیان تین سال تک اس سلسلے میں گفت گو ہوتی رہی، بالآخر 17/اگست 1849ء کو ہندوستان پر قابض ایسٹ انڈیا کمپنی نے آمادگی کا اظہار کیا اور لندن کی دو نجی کمپنیوں کو ریل کی تعمیر کی اجازت دے دی گئی۔ ان کمپنیوں نے معاشی مفادات کے تحت کلکتہ سے شمال مغرب میں موجود کوئلے کے ذخائر تک ایک پٹری بچھائی اور دوسری کپاس کی پیداوار کے مرکز اندرون دکن سے بمبئی تک پٹری بچھائی گئی۔ یہ دونوں پٹریاں کمپنیوں کے مالی مفادات کو تحفظ دینے کی ضمانت کے تحت بنائی گئیں۔ (4) ہندوستان میں امپیریل ریلوے لائنز کی تعمیر سے قبل ہی گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے 1843ء میں حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر حکومتِ ہند، کامرس اور ملک پر ملٹری کنٹرول حاصل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔ (5)

1850ء سے لے کر 1924ء تک ہندوستانی ریلوے برطانیہ کی نجی کمپنیوں کے زیر کنٹرول رہی۔ 74 برس کا یہ عرصہ نجی کمپنیوں کے استحصال کا پہلا عہد ہے۔ ہندوستان میں ریلوے لائنز بچھانے کا پُر زور مطالبہ بھی مالی مفادات کے تحت لندن و مانچسٹر کی تجارتی کمپنیوں کی جانب سے کیا گیا تھا۔ ریلوے کا بنیادی مقصد ہندوستان کا خام مال بندرگاہوں تک تیزی سے پہنچانا اور ہندوستانی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کرنا تھی، حتیٰ کہ ریل گاڑیوں کو چلانے کے لیے کوئلہ بھی ہندوستان سے حاصل کیا جاتا تھا۔ جس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے یورپی کمپنیوں کے ساتھ معاہدات کیے۔ چناں چہ 1853ء میں پہلی ریل پٹری بمبئی پورٹ

www.ranimia.org

سے تھانہ تک بچھائی گئی، جس کی لمبائی 20 میل تھی اسی طرح1854ء میں کلکتہ بندرگاہ اور 1856ء میں مدراس بندرگاہ تک ریل پٹری بچھائی گئی۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کا سیاسی اقتدار کمپنی سے برٹش کراؤن کو منتقل ہوگیا۔ چناں چہ ریل بھی کراؤن کے پاس چلی گئی۔(6)

1880ء سے لے کر1890ء تک ریلوے لائنز9,308 میل سے بڑھ کر24,752 میل ہوگئی۔ ریل پٹری کی تعمیر میں یہ اضافہ 7.5 فی صد سالانہ تھا۔ بیسویں صدی یعنی1900ء میں ہندوستان کا ریلوے نظام دُنیا کا چوتھا بڑا نیٹ ورک بن گیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی (7) نے بمبئی، کلکتہ، مدراس سے دہلی تک کے کمرشل روٹس بنانے کی ہدایات کیں۔ ہندوستان کی ان تینوں بندرگاہوں کو بذریعہ ریلوے اہم شہروں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ ڈلہوزی نے1853ء کی یادداشت میں لکھا:

> ''ہندوستان میں ریل پٹری بچھانے کے لیے راستوں کا تعین کرتے وقت سب سے پہلے سیاسی و کمرشل مفادات کے تحفظ کو مدِنظر رکھا جائے۔ کلکتہ سے دہلی، دہلی سے شمال مغربی فرنٹیئر، بمبئی سے متحدہ صوبہ جات اور مدراس سے بمبئی تک کی ریل پٹری انھی مفادات کے تحت بچھائی گئی۔''(8)

چناں چہ ڈلہوزی کی سفارشات پر ریل کی مرکزی پٹریوں کی تعمیر تیزی سے ہونے لگی۔ کلکتہ سے لاہور تک مرکزی پٹری کی تعمیر کو سیاسی و معاشی مفادات کے تناظر میں دہلی، آگرہ، امرتسر اور لاہور تک پہنچایا گیا۔ پھر ان پٹریوں کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم کالونیل پورٹس کے ساتھ ملا دیا گیا۔ ڈلہوزی کے بعد1870ء تک ہندوستان میں بچھائی جانے والی ریل پٹری میں سیاسی مفادات کے ساتھ ساتھ تزویراتی نقطہ نظر کو بھی اہمیت دی گئی۔ 1880ء کے بعد سرکاری رپورٹس میں متعدد ریلوے پٹریوں کو فوجی و دفاعی اور تزویراتی مقاصد کے ذیل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ابتدائی پٹریوں کی تعمیر پانچ فٹ چھ انچ چوڑائی پر کی گئی، جس کے باعث ریل کی تعمیر کے اخراجات کئی گنا بڑھ گئے، جب کہ اس عہد میں برطانیہ اور امریکا میں یہ چوڑائی چار فٹ آٹھ انچ تھی۔ 1870ء میں انجینئرز کی مداخلت پر ریل پٹریوں کی چوڑائی تین فٹ سوا تین انچ کر دی گئی۔

ہندوستانی ریلوے اور برطانوی نجی کمپنیاں

نوآبادیاتی ہندوستان میں ریل کی ابتدائی تعمیر برطانیہ کی نجی کمپنیوں نے کی۔ اس کے بعد حکومتِ ہند اور ہندوستان کی خود مختار ریاستوں کے والیان کی معاونت سے ریل کی تعمیر کو آگے بڑھایا گیا۔ 1879ء تک برطانیہ کی نجی کمپنیوں نے Public Guarantee کے تحت پٹریوں کی تعمیر کی اور1870ء کے بعد پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ متعارف کرائی گئی، تاہم ان معاہدات میں ریل کی تعمیر و آپریشنز کے اختیارات نجی کمپنیوں کے پاس ہی رہے۔ بالآخر1924ء میں ہندوستانی ریل کا پورا نظام سامراجی حکومت نے براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ 1908ء تک برطانیہ نے ہندوستان کے ریلوے پر274 ملین پاؤنڈز کی سرمایہ کاری کی۔ یہ سرمایہ کاری ہندوستانیوں کی ٹیکس کی رقوم کی مدد سے کی گئی، حتیٰ کہ ریل آپریشنز کے اخراجات بھی ہندوستانیوں سے وصول کیے جاتے رہے۔ لندن میں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ پر مکمل کنٹرول ان نجی کمپنیوں کا تھا اور برطانیہ کے بینکوں کی مداخلت سے یہ کنٹرول مزید مضبوط ہوگیا۔ یونین بینک آف لندن نے برما ریلوے کمپنی میں بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ دوسری

www.rahimia.org

جانب ریلوے سیکیورٹی بانڈز کی تقسیم کا اختیار یورپ کے طاقت ور مالی خاندان Rothschild کے پاس تھا، جس کی نگرانی N.M.Rothschild کر رہا تھا۔ ریلویز کے ذریعے سے اس خاندان نے ہندوستان میں اپنی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ N.M.Rothschild نے ہندوستان کی ریلوے میں 82 لاکھ پاؤنڈز کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ یہ خاندان یورپ میں ریل کی تعمیر کے لیے1830ء سے سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ ہندوستان میں صرف ریلوے ہی نہیں، بلکہ N.M.Rothschild ہندوستان میں Fowler Indian Currency Committee of 1899 اور Mackay Indian Railway Committee of 1908 کا اہم رکن تھا۔ ہندوستانی ریلوے کو فنانس کرنے کے ساتھ ہندوستان میں لوکوموٹوز کی فروخت بھی Rothschild نے کی۔(9)

ہندوستان میں ریل کی تعمیر کے لیے دس نجی کمپنیوں کو ٹھیکے دیے گئے۔ یہ تمام کمپنیاں برطانوی سرمایہ کاروں کی ملکیت تھیں، جن کے ہیڈ کوارٹرز لندن میں تھے، جب کہ ہندوستان کے ریٹائرڈ برطانوی فوجی افسران اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بھی ان نجی کمپنیوں کے حصہ دار تھے۔ ان میں ایسٹ انڈین، گریٹ انڈین پینن سولا، ایسٹرن بنگال، بمبئی برودا اینڈ سنٹرل انڈیا، سندھ پنجاب اینڈ دہلی، مدراس، ساؤتھ انڈین اور اَودھ اینڈ روہیل کھنڈ کمپنیاں شامل ہیں۔ ان کمپنیوں نے ریل کی مرکزی پٹریوں کی تعمیر، بندرگاہوں کے ساتھ منسلک کرنے اور دیگر شہروں تک پہنچانے کے لیے تعمیراتی کام میں حصہ لیا۔ اس کے لیے برطانوی سامراج نے جوائنٹ سٹاک کمپنیز بنائیں۔ کمپنیوں کو ٹھیکے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کے ذریعے سے دیے جاتے، جس کا دفتر لندن میں تھا اور ان ٹھیکوں کی نگرانی ہندوستان میں برطانوی سامراج کے گورنر جنرل کے سُپرد تھی۔ کمپنیوں کے ۹۰ فیصد شیئر ہولڈرز برطانوی تھے۔ ان شیئر ہولڈرز میں برٹش فنانشل ایلیٹ، ریٹائرڈ ممبر آف برٹش ملٹری اور کمپنیوں کے سربراہان شامل تھے۔(10)

(الف) ہندوستانی ریلوے پر تعمیراتی اخراجات

1869ء تک حکومتی گارنٹیڈ سسٹم کے تحت تعمیر ہونے والی ریلوے پٹریوں کی لاگت زیادہ تھی۔ فی میل ریل پٹری پر تعمیر کی لاگت17,000 پاؤنڈز تھی، حال آں کہ ابتدا میں ڈبل لائن کی تعمیر کی لاگت کا تخمینہ15,000 اور سنگل لائن کا تخمینہ9,000 پاؤنڈز فی میل لگایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ برطانوی سامراج نے ہندوستانی خزانے سے مجموعی سرمایہ کاری کے پانچ فی صد حصے پر خالص منافع بھی کمپنی کو دینے کی پالیسی نافذ کر رکھی تھی۔ اس لیے حکومتِ ہند کو سرمایہ کاری پر منافع کے اہداف پورے نہ ہونے پر ہر سال لاکھوں پاؤنڈز کی رقم جرمانے کی مد میں کمپنیوں کو دینی پڑی، جو کہ ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا۔(11) جب کہ اسی دور میں امریکا میں ریلوے کی تعمیر پر فی میل2,000 پاؤنڈز لاگت تھی۔(12) مثال کے طور پر بنگال سنٹرل کمپنی کو مفت زمین کے ساتھ پانچ سال تک مجموعی سرمائے پر پانچ فی صد سود ادا کیا گیا، جب کہ روہیل کھنڈ کمپنی کو چار فی صد گارنٹی کے ساتھ سالانہ 40,000 روپے سبسڈی دی گئی اور یہ سبسڈی حکومتِ ہند نے ہندوستانی خزانے سے دس سال تک ادا کی۔ یہی وَجہ ہے کہ نجی کمپنیوں نے سرمائے کی لاگت کی پرواہ کیے بغیر مہنگی ترین ریلوے لائنز ہندوستان کے طول و عرض میں بچھائیں۔ ہندوستانی خزانے سے1869ء تک مجموعی طور پر52,500,000 پاؤنڈز ان کمپنیوں کو ادا کیے گئے۔(13)

1855ء میں W.P. Andrew کی سربراہی میں سندھ ریلوے کمپنی بنائی گئی اور اس کمپنی کے ساتھ حکومت نے چار فی صد سود پر معاہدہ کیا۔ حکومت نے اس کمپنی کو 99 سال کے لیے مفت زمین فراہم کی۔ معاہدے کے تحت یہ کمپنی ڈاک اور دفاعی ساز و سامان کم ترین قیمت پر ایک جگہ سے دوسری جگہ ترسیل کرنے کی پابند تھی، جب کہ حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ وہ اس کمپنی سے 25 سال بعد ریلوے لائنز خرید سکتی ہے۔ کمپنی کا مرکزی دفتر لندن میں تھا، جہاں سے سرولیم اینڈریو منصوبے کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کمپنی نے شمال مغربی علاقہ جات میں 666 میل ریلوے لائن بچھائی جس پر 9,308,016 پاؤنڈز لاگت آئی۔ اوسطاً فی میل پر 13,976 پاؤنڈز خرچ ہوئے۔ [14]

نجی کمپنیوں کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج نے 1882ء میں Assisted Companies متعارف کرائیں۔ دو سال بعد ان کمپنیوں کی تعداد گیارہ ہوگئی۔ ان کمپنیوں میں سدرن مرہٹہ نے 435 میل، بنگال اینڈ نارتھ ویسٹرن نے 455 میل اور بنگال سنٹرل کمپنی نے 125 میل پٹریاں تعمیر کیں۔ [15] شمال مغربی ہندوستان میں نوآبادیاتی ریلوے پالیسی میں ملٹری اور تزویراتی نقطہ نظر کو انتہائی اہمیت حاصل تھی۔ ریل پٹریوں کو بچھانے کے لیے ملٹری انسٹالیشنز، کنٹونمنٹس اور اسلحہ ڈپو کے مقامات کو بھی مدِ نظر رکھا گیا، بالخصوص کلکتہ سے پشاور تک برطانوی استعمار کی دفاعی لائن کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر دہلی، لاہور، پشاور لائنز براہ راست 10 کنٹونمنٹس سے منسلک تھیں۔ 1900ء کے بعد ریل کی پٹریوں کی توسیع کے لیے جنرل آفیسر کمانڈنگ آف ڈسٹرکٹ سے باقاعدہ طور پر اجازت لینے کی شرط عائد کر دی گئی تھی، جب کہ دوسری طرف امپیریل فوج کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی بھی وقت حکومتی اجازت کے بغیر ریل نیٹ ورک میں توسیع کرنے کی مجاز تھی۔ [16] ہندوستان کی امپیریل فوج کے لیے ریلوے اور کمرشل ریلوے کا بجٹ علاحدہ علاحدہ تھا۔ 1942ء میں ریلوے بجٹ کو جنرل بجٹ سے الگ کر دیا گیا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ریلوے کا بنیادی مقصد ہندوستان کی ترقی نہیں تھا، بلکہ ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ہندوستان کا استحصال اور ہندوستانی دولت کی لوٹ کھسوٹ سے برطانوی کالونیل مقاصد کی تکمیل کرنا تھا۔ 1910ء میں شمال مغربی ریلویز کے ٹریک کی لمبائی 3733.6 میل تھی جس میں سے ایک تہائی ٹریک تزویراتی مقاصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ 1925ء میں 5828.14 میل ٹریک تھا جس میں سے 1472.20 میل تزویراتی یا ملٹری ریلویز تھی جو کہ مجموعی ریل پٹری کا 35 فیصد ہے۔ [17]

(ب) لوکوموٹو انجن کی خریداری

1872ء میں لندن کے قریب کوپر ہل پر رائل انڈین انجینئرنگ کالج قائم کیا گیا، جس کا مقصد ہندوستان کی ریلوے کے لیے انجینئرز تیار کرنا تھا۔ 1886ء میں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں 1015 میں سے صرف 86 ملازمین ہندوستانی تھے، جب کہ 1862ء میں بنگال، اجمیر اور جمال پور میں ریلوے ورکشاپیں قائم کی گئیں۔ یہاں پر موجود ہندوستانی انجینئرز نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر لوکوموٹو انجن کی تیاری اور ڈیزائننگ کا تجربہ شروع کر دیا اور 1878ء میں ہندوستانی خود ریل انجن بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کامیابی نے برطانوی سامراج کو چونکا دیا، کیوں کہ یہ انجن سستے اور معیار میں یورپی لوکوموٹو سے قدرے بہتر تھے۔ تین دہائیوں تک ان فیکٹریوں میں مقامی طور پر انجن تیار ہوتے رہے۔ اس کے بعد 1912ء میں برٹش پارلیمنٹ نے ایکٹ

www.rahimia.org

پاس کیا، جس کے تحت ہندوستانی ورکشاپس میں لوکوموٹو کی تیاری پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی فیکٹریوں میں انجن کی تیاری روک دی گئی اور ہندوستانیوں فیکٹریوں کو پابند بنایا گیا کہ وہ صرف برطانیہ اور یورپ سے درآمد شدہ انجنوں کی مرمت اور دیکھ بھال کرنے کی مجاز ہوں گی۔ 1854ء سے لے کر 1947ء تک ہندوستان نے برطانیہ سے 14,400 لوکوموٹیو انجن درآمد کیے اور 3,000 لوکوموٹو کینیڈا، امریکا اور جرمنی سے درآمد کیے گئے، جب کہ 1912ء کے بعد مقامی طور پر انجنوں کی تیاری مکمل طور پر بند کر دی گئی تھی۔ برطانیہ اور یورپ میں اتنے بڑے پیمانے پر لوکوموٹو کی تیاری سے وہاں پر روزگار کے مواقع پیدا ہوئے، جس سے براہ راست یورپین معیشت کو ہندوستانی دولت سے فوائد حاصل ہوئے۔ [18] ہندوستان میں جمال پور کی ورکشاپ میں پہلا لوکوموٹو انجن 1899ء میں 33,000 روپے کی لاگت سے تیار کیا گیا، جب کہ درآمد شدہ لوکوموٹو کی قیمت 47,897 روپے تھی۔

ریلوے کمپنیوں کے ساتھ معاہدات

برطانوی سامراج نے لندن کی نجی کمپنیوں کو ریلوے کی تعمیر کے لیے ہندوستان کی زمینیں 99 سال کے لیے مفت مہیا کیں۔ کمپنیوں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ان ننانوے سالوں کے دوران کسی بھی وقت معاہدے کو منسوخ کرنے کی مجاز تھیں۔ کمپنیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدات کے تحت 25 یا 50 سال کے بعد حکومت کمپنی کو خرید سکتی تھی۔ ریلوے سے حاصل ہونے والی آمدن سے تمام اخراجات نکالنے کے بعد خالص منافع ہندوستان کے خزانے میں جمع ہونا تھا۔ اگر خالص منافع مجموعی سرمایہ کاری کے پانچ فی صد سے کم ہوگا تو اس کا جرمانہ حکومت ہند ادا کرے گی۔ معاہدات میں یوں لکھا گیا:

> ''کمپنی اپنی خالص آمدن (یعنی مجموعی آمدن سے اخراجات نکال کر) حکومتی خزانے میں جمع کرائے گی اور حکومت اپنا حصہ کاٹ کر بقیہ رقم کمپنی کو واپس کرے گی۔ اگر خالص آمدن کا سرمائے کے لحاظ سے تناسب کسی بھی سال میں پانچ فی صد کی ضمانت کے مقابلے میں کم ہو تو حکومت کمپنی کو معاہدے کے تحت لاگت کردہ سرمائے کا پانچ فی صد تک کے فرق کی ادائیگی کی پابند ہوگی اور ایسی ضمانتوں کو بہ طور قرض تصور کیا جائے گا۔ جب سالانہ خالص آمدن ضمانت کی سطح سے تجاوز کر جائے تو کمپنی کو ان کے پانچ فی صد سے زائد اضافی منافع کا نصف حکومتی خزانے میں جمع کرانا ہوگا، گزشتہ تمام ضمانتوں کی ادائیگی ہونے کے بعد بقیہ اضافی منافع کے حصول کی حق دار کمپنی ہوگی۔'' [19]

ریلوے ٹریک کی ابتدائی تعمیراتی لاگت اندازے سے زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر 1860ء سے لے کر 1869ء تک خالص منافع تین فی صد سے بھی کم رہا، لہٰذا حکومتِ ہند پر دباؤ ڈالا گیا کہ شیئر ہولڈرز کو سرمایہ کاری پر پانچ فیصد Guarantee کی ادائیگی یقینی بنائی جائے۔ حکومت کی جانب سے دی جانے والی گارنٹی کے مطابق آمدن نہ ہونے کے باعث حکومت ہند کو 1869ء میں ان کمپنیوں کو 3 کروڑ پاؤنڈز جرمانے کی رقم ادا کرنا پڑی۔ دراصل Guarantee کے ذریعے سے حکومتِ ہند ریلوے کے معاملات میں براہِ راست مداخلت کرنے کی مجاز تھی۔ معاہدے کے تحت اگرچہ حکومتِ ہند کا نمائندہ کمپنی بورڈ کا ممبر ہوتا تھا، جس کی تقرری سیکرٹری آف سٹیٹ کی جانب سے کی جاتی، لیکن عملی طور پر یہ نمائندہ بورڈ میں غیر مؤثر ہوتا تھا۔ اس کی

www.tanimia.org

بنیادی وجہ یہ تھی کہ سیکرٹری آف سٹیٹ کا دفتر لندن میں تھا اور کمپنیوں کے مرکزی دفتر بھی لندن میں تھے۔ چناں چہ یہ کمپنیاں سیکرٹری پر براہِ راست اثر انداز ہوتی تھیں۔

مثال کے طور پر 1860ء میں حکومتِ ہند نے چند ریلوے کمپنیوں کو سدرن انڈیا ریلوے میں ضم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں مدراس ریلوے کمپنی بھی شامل تھی۔ حکومتِ ہند کی کوششوں کے باوجود مدراس ریلوے کمپنی نے انضمام سے انکار کر دیا۔ یوں حکومت کو اپنا ہی فیصلہ واپس لینا پڑا، کیوں کہ سیکرٹری آف سٹیٹ کا جھکاؤ کمپنی کی طرف تھا۔ اسی طرح 1885ء میں حکومتِ ہند نے انٹر ریلویز تنازعات کو حل کرانے اور یکساں کرائے نامے نافذ کرنے کے لیے clearing house بنانے کا فیصلہ کیا، لیکن ریلوے کمپنیوں کی مخالفت کے باعث حکومت کو اس فیصلے میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔[20]

حکومتِ ہند اور لندن میں مقیم سیکرٹری آف سٹیٹ کے درمیان تنازعے کا آغاز 1869ء میں ہوا جب سیکرٹری نے چار بڑی ریلوے کمپنیوں کے کنٹریکٹ کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ اس کے لیے حکومتِ ہند سے مشاورت تک نہیں کی۔ کمپنی نے معاہدے کے تحت منافع کی رقم حکومت کو جمع کرانا تھی، تاہم سیکرٹری نے کمپنی پر عائد اس پابندی کو ختم کر دیا، حتیٰ کہ کمپنی کو 25 سال بعد خریدنے کا حکومتِ ہند کا اختیار بھی سلب کر لیا گیا۔ حکومتِ ہند اس فیصلے کی مخالفت کے باوجود کمپنیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ان کمپنیوں میں

1۔ Great Indian Peninsula (گریٹ انڈین پینن سولا)
2۔ The Bombay, Baroda & Central India (بمبئی، بروداا اینڈ سنٹرل انڈیا)
3۔ Madras Railways Company (مدراس ریلویز کمپنی)

شامل تھیں۔

برطانوی سامراج، انڈسٹریل پالیسی اور ریلوے

یورپی صنعتی انقلاب کا آغاز اور بنگال میں برطانوی سامراج کا تسلط بہ یک وقت شروع ہوتا ہے۔ جب تک ہندوستان کی دولت کی برطانویوں، فرانسیسیوں، پُرتگیزیوں نے لوٹ مار شروع نہیں کی، اُس وقت تک صنعتی انقلاب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرمایہ ہی موجود نہیں تھا۔ چوں کہ صنعتی ایجادات کی صورت پذیری کے لیے سرمایہ درکار تھا، اس لیے بنگال میں سراج الدولہ کو شکست ہونے کے بعد 1757ء میں یہاں کے خزانوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے یا یہاں پر فروخت کرنے کے لیے کچھ دستیاب نہیں تھا، لہٰذا یہاں کی دولت و وسائل پر قبضے ہی کمپنی کے اصل اہداف تھے۔ جب برطانیہ میں 1804ء میں ریل متعارف ہوئی تو سرمایہ دارانہ نظام ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ اسی عرصے میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادکاروں نے اپنے حریفوں کو شکست دینے کے بعد دولت مند ہندوستان کے وسائل پر اپنی نظریں جما لیں۔ اس طرح نوآبادیاتی تقاضوں کے تناظر میں برطانوی سامراج نے ہندوستان کے لیے انڈسٹریل پالیسی متعارف کرائی۔ اس پالیسی سے متعلق نامور ہندوستانی محقق ششی تھرور نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں یونین سے خطاب کے دوران کہا کہ:

''یورپ کی انڈسٹریلائزیشن ہندوستان کی ڈی انڈسٹریلائزیشن کی قیمت پر ہوئی ہے، کیوں کہ یہاں کی کپڑا

www.rahimia.org

سازی کی صنعت، جہاز رانی کی صنعت، لوہا سازی کی صنعت کو برطانوی سامراج نے یکسر تباہ کر دیا۔ اس ڈی انڈسٹریلائزیشن میں ہندوستان کے امپیریل ریلوے کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں ریل کے ذریعے سے فوجی کمک کی ترسیل اور گریٹ گیم کے تناظر میں ریل نیٹ ورک کو قندھار تک پہنچانا استعماری مقاصد میں شامل تھا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان یورپ سمیت دُنیا بھر میں ٹیکسٹائل کی برآمدات کرنے والا بڑا ملک تھا۔ 1750ء میں دُنیا بھر میں ہندوستان کی صنعتی پیداوار 25 فی صد تھی، جب کہ استعماری ونوآبادیاتی پالیسی کے باعث 1900ء میں ہندوستان کی صنعتی پیداوار صرف 2 فی صد رہ گئی۔[21]

یہ استعماری منصوبہ بندی کا ہی نتیجہ تھا کہ پہلی ریل گاڑی تو 1853ء میں چلائی گئی، لیکن ریلوے سے متعلق قانون سازی پر مشتمل ریلوے ایکٹ 1890ء میں نافذ ہوا۔ ابتدائی تقریباً چالیس سالوں میں ریلوے کے افسران و ملازمین پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت کام کرتے رہے، تاہم 1905ء میں ریلوے بورڈ قائم ہوا۔ اس بورڈ کے قیام کا مقصد ریلوے پالیسی، مستقبل میں نئی ریلوے پٹریوں کی تعمیر کا فیصلہ اور آپریشنز کی نگرانی کرنا تھا۔ پاکستان میں آج بھی استعماری ونوآبادیاتی عہد میں بنایا گیا ریلوے ایکٹ نافذ ہے۔

(الف) ریلوے اور معاشی مفادات

برطانوی سامراج کی معاشی پالیسیوں کے باعث ہندوستان کو انڈسٹریلائزیشن سے نکال کر زرعی معیشت پر جامد کر دیا گیا۔ ہندوستان کو صرف خام مال کی پیداوار کو بڑھانے اور اس مال کی یورپی ممالک میں ترسیل کو مدِ نظر رکھا گیا۔ تفصیلات کے مطابق:

- ☆ 1750ء میں ہندوستان کی دُنیا میں صنعتی پیداوار 24.5 فی صد تھی۔
- ☆ 1800ء میں کم ہو کر 19.7 فی صد
- ☆ 1880ء میں 2.8 فی صد
- ☆ 1913ء میں 1.4 فی صد تک گر گئی۔[22]

ہندوستان کی تجارت کو یورپی کمپنیوں کے ذریعے سے کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ منافع کی شرح زیادہ ہونے کی بنا پر ان کمپنیوں نے ہندوستان میں سرمایہ کاری کی۔ 1898ء میں Finely Group نے چائے کی پتی کے کاروبار میں 4.36 ملین پاؤنڈز کی سرمایہ کاری کی۔ اسی گروپ نے 1873ء میں پٹ سن، 1882ء میں جہاز رانی کی صنعت اور پھر 1902ء میں کاٹن ملز میں سرمایہ کاری کی۔ 1911ء میں ہندوستان میں 373 جوائنٹ سٹاک کمپنیاں کام کر رہی تھیں، لیکن یہ کمپنیاں ہندوستان سے باہر رجسٹرڈ تھیں۔ حکومتِ ہند نے ان کمپنیوں کو Capital Totalling کی مد میں 77.979 ملین پاؤنڈز، جب کہ قرضوں کی ادائیگی کے لیے 45.353 ملین پاؤنڈز ادا کیے۔[23]

(ب) فوجی، دفاعی اور گریٹ گیم کے تناظر میں ریلوے کی تعمیر

اُنیسویں صدی کے دوران ایشیا میں ''گریٹ گیم'' کی بساط بچھ چکی تھی اور اس کھیل میں حصّہ لینے کے لیے برطانیہ، فرانس،

www.rahimia.org

جرمنی اور رُوس سمیت دیگر ممالک تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد برطانوی حکومت کی نگاہیں ہم سایہ ممالک، افغانستان اور ایران پر مرکوز تھیں۔ ممکنہ روسی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بھی افغانستان کے ساتھ دوستانہ روابط یا اس پر قبضہ انگریزوں کی اوّلین ترجیح تھی۔ پھر برطانیہ کے سیاسی و تجارتی حریف فرانس نے، جو نپولین بونا پارٹ کے دَور میں ایک طاقت وَر ملک کی صورت اختیار کر چکا تھا، برطانیہ کو زک پہنچانے کی خاطر ہندوستان کی طرف پیش قدمی کے لیے افغانستان کے امیر زمان شاہ سے روابط استوار کر لیے تھے، تاہم برطانوی حکومت کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگا کہ جب روس کے زار الیگزنڈر اور فرانس کے نپولین بونا پارٹ متحد ہو گئے۔ ان دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت دونوں بڑی طاقتوں نے مل کر ایران کے راستے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔ روس نے 1864ء میں سمرقند پر اور پھر 1873ء میں خیوا اور تاشقند پر قبضہ کر لیا۔ چوں کہ برطانوی حکومت کو ہمہ وقت افغانستان یا ایران کے راستے کوئٹہ اور گوادر پر روسی قبضے کا دھڑکا لگا رہتا تھا، لہٰذا ممکنہ روسی حملوں کی روک تھام اور افغانستان کو اپنا ماتحت ملک بنانے کے لیے برطانیہ نے افغانستان پر تین بار فوج کشی کی، جو افغان جنگ اوّل، دوم اور سوم کے نام سے مشہور ہیں۔ (24)

پہلی افغان جنگ (1839ء - 1842ء) میں سندھ میں برطانوی فوج کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور اسی لیے پہلے مشہور برطانوی فوجی افسر جنرل سر چارلس نیپیئر اور بعد میں بریگیڈیئر جنرل جان جیکب کو صوبہ سندھ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ یعنی سندھ کو دفاعی قوت کا ایک اہم مرکز بنایا گیا، تاکہ یہ بلوچستان اور افغانستان میں برطانوی مفادات اور دِفاعی ضروریات پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرے۔ پھر سندھ ہی سے بہ وقتِ ضرورت بلوچستان یا سرحد پار عسکری کمک پہنچائی جاتی تھی۔

جنگی حکمتِ عملی کے تحت ملٹری فرنٹیئر ریلوے کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے دو اہم راستوں کا انتخاب کر کے ان پر کام شروع کیا گیا، جو درۂ بولان اور درۂ خیبر تھے۔ یہ دونوں راستے "Two Gates of India" کے نام سے مشہور تھے۔ منصوبے کے تحت شمال مغربی ریلوے سیکشن میں 1,500 میل طویل پٹریاں بچھائی گئیں۔ منصوبے میں سندھ سے سبی تا بوستان کے علاوہ بولان سے کوئٹہ، چمن اور قندھار تک ریلوے نیٹ ورک کی رسائی بھی شامل تھی۔ برطانوی حکومت 1876ء سے کوئٹہ کے راستے افغانستان اور پھر ایران کی سرحد تک اسٹریٹیجک لائن کی تعمیر پر غور کر رہی تھی، تاکہ فوجی نقل و حرکت تیزی کے ساتھ ممکن ہو سکے۔ اس مقصد کے تحت سکھر اور شکار پور کے درمیان واقع رُک اسٹیشن سے ریلوے لائن کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس منصوبے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے 1879ء کے موسمِ خزاں میں گورنر بمبئی سر رچرڈ ٹیمپل کو رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ مل کر ریلوے لائن کی تعمیر میں حصہ لینے کی خصوصی ہدایت کی۔ اس منصوبے کے لیے تمام مالی وسائل فراہم کرنا بھی بمبئی حکومت کی ذمے داری تھی۔ منصوبے کا اصل نام ''قندھار اسٹیٹ ریلوے'' تھا، جس کے تحت ریلوے لائن کوئٹہ سے چمن اور پھر افغانستان کے شہر قندھار تک پہنچانا مقصود تھی، تاکہ گریٹ گیم کے لیے درکار فوجی ساز و سامان کی ترسیل میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو۔ 1898ء میں مشہور رُک اسٹیشن تعمیر کروایا گیا، تاکہ یہاں سے ریل گاڑی کوئٹہ کے راستے سے قندھار، وسطی ایشیا اور ایران سے ہوتے ہوئے یورپ تک کا سفر کرے۔ (25)

''گریٹ گیم'' (Great Game) کی اصطلاح پہلی بار بنگال کیولری کے آفیسر Arthur Connolly نے استعمال کی

www.ranima.org

تھی۔ برطانوی سامراج کو ادراک تھا کہ روسی و فرانسیسی جارحیت کے پیشِ نظر شمالی علاقہ جات پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ لاہور تا پشاور ریل پٹڑی کے ذریعے سے کالونیل پنجاب میں قائم پانچ کنٹونمنٹس کو آپس میں منسلک کر دیا گیا۔

پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلویز کمپنی نے درجِ ذیل ٹریک ملٹری ریل منصوبے کے تحت بنائے:

- ☆ دسمبر 1875ء میں لاہور سے گجرات 71 میل پٹڑی کی تعمیر مکمل کی۔
- ☆ ستمبر 1876ء میں جہلم تک 103 میل ٹریک کی تعمیر مکمل ہوئی۔
- ☆ اکتوبر 1878ء میں جہلم سے راولپنڈی تک 76 میل ٹریک مکمل کیا گیا۔
- ☆ 1882ء میں خیر آباد کُنڈ (Khairabad Kund) کو پشاور سے ملا دیا گیا۔

1883ء میں اٹک پُل کی تعمیر سے کالونیل سیکیورٹی کو مستحکم رکھنے کے لیے ملٹری ریل کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان سے 15 لاکھ فوجیوں نے شمولیت کی اور ان فوجیوں کی نقل و حمل اور اسلحہ و بارود کی ترسیل ریل گاڑیوں کے ذریعے سے ہوئی۔ [26]

(ج) ریلوے ٹریک کیلئے جنگلات کی کٹائی

نوآبادیاتی عہد میں برطانوی سامراج نے اس خطے کی معاشی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ یہاں کے ماحولیات پر بھی منفی اثرات مرتب کیے۔ ریلوے پٹریوں کی تعمیر کے لیے ٹریک پر بچھائی جانے والی لکڑی کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں درختوں کو کاٹ دیا گیا اور اس کے لیے پورے پورے جنگلات ملیا میٹ کر دیے گئے۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے ہندوستان کے وسائل کو لوٹنے کے لیے جس ریل کی بنیاد رکھی تھی، جنگلات بھی سامراج کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کالونیل عہد میں جنگلات کی تباہی نے جہاں درجہ حرارت پر منفی اثر ڈالا، وہیں پر جنگلی حیات کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔ برطانوی سامراج یورپی سرمایہ داروں کو ریلوے میں سرمایہ کاری کرنے پر آمادہ کرتا رہا، کیوں کہ ریلوے جہاں ہندوستانی وسائل کو یورپ منتقل کرنے کا باعث تھی، وہیں پر اس شعبے میں سرمایہ کاری انتہائی منافع بخش تھی۔ یہی وَجہ تھی کہ 1853ء میں 20 میل ریل پٹری 1900ء میں بڑھ کر 23,627 میل ہوگئی۔ ہندوستان کی زرعی اجناس بہ شمول گندم، آئل سیڈز، چائے، کپاس بذریعہ ریل یورپ منتقل کی جاتی۔ پنجاب میں ریل کی تعمیر کا آغاز 1859ء میں ہوا اور تعمیراتی کام پنجاب ناردرن ریلویز، انڈس ویلی ریلویز، راجپوتانہ سٹیٹ ریلوے اور امرتسر پٹھان کوٹ ریلوے کی کمپنیوں نے مکمل کیا۔ 1884ء تک ٹریک کی لمبائی 1,300 میل تھی۔

ریلوے کی تعمیر کے لیے جہاں مشینری، انجن اور زمین درکار تھی، وہیں پر پٹڑی کے لیے لکڑی، آگ جلانے کے لیے لکڑی و کوئلہ بھی درکار تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مقامی جنگلات سے لکڑیوں کی سپلائی کو یقینی بنایا گیا۔ ریل گاڑی میں سلیپر بنانے کے لیے بھی جنگلات کی لکڑی کا استعمال کیا گیا۔ گویا ریلوے کی تعمیر ماحولیاتی تباہی کی قیمت (Econological Cost) پر کی گئی۔ ریل گاڑیوں میں سلیپر بنانے کے لیے دیودار، Salwood اور ساگوان کی لکڑی کو مضبوطی و پائیداری کے باعث اہمیت دی گئی۔ چناں چہ 1861ء میں پنجاب میں دیودار کے جنگلات کی کٹائی شروع کی گئی۔ جنگلات کی کٹائی کے حوالے سے 1861ء

www.rahmia.org

کی سرکاری رپورٹ کا متن ملاحظہ کیجیے:

''یہ معلوم ہوا کہ ریلوے سلیپرز کے لیے دیار کی لکڑی کو بہترین پایا گیا اور لکڑی کی مطلوبہ مقدار میں سپلائی کے لئے انڈس سے ستلج تک ہر پہاڑی علاقے کو برباد کیا گیا۔ جہلم اور چناب کے تقریباً تمام وسائل استعمال کر لئے گئے اور ستلج کے جنگلات کا بھی صفایا کیا گیا۔ وہ جنگلات جو دریا کے قریب تھے ان کا بھی صفایا کیا گیا اور صرف وہی درخت دیکھے جا سکتے تھے جو دریا سے ایک میل یا اس سے زیادہ دور تھے۔''(27)

پنجاب میں ریلوے کی تعمیر تیزی سے کی جا رہی تھی۔ 1860ء تا 1884ء کے دوران سالانہ 186.58 میل پٹری تعمیر کی گئی۔ ریل گاڑیوں میں سلیپر کے لیے لکڑی کی کتنی کھپت درکار تھی۔ حکومتِ پنجاب کے کنسلٹنگ انجینئر کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے:

''ملتان ریلوے لائن کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سلیپرز کے لیے نہایت بھاری مقدار میں لکڑی کی ضرورت تھی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ملتان لائن کا منصوبہ تین برس میں پایہ تکمیل پر پہنچنا تھا تو 36 مہینوں میں لکڑی کے 12,000 سلیپرز درکار تھے، یعنی سالانہ پانچ لاکھ کیوبک فٹ لکڑی درکار تھی۔ فرض کیا جائے کہ لکڑی کے ایک لاگ سے 40 کیوبک فٹ لکڑی حاصل کی گئی تو ہر سال ہمیں 12,500 لاگ پر مشتمل لکڑی درکار رہے یا تین سالوں میں صرف سلیپرز کے لیے 37,500 لاگ درکار ہیں۔ اب 32 میل طویل امرتسر ریلوے لائن کے لیے 57,600 سلیپرز درکار تھے، جس میں ریلوے اسٹیشن اور پلیٹ فارم بھی شامل ہیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ تقریباً 18 مہینوں میں 5000 درختوں کی کٹائی درکار تھی جن کی لمبائی فی لانگ 40 کیوبک فٹ ہو۔''(28)

پنجاب اور دہلی ریلوے کے لیے سلیپرز کی ضرورت

امرتسر سے ملتان تک ریلوے ٹریک کی کل لمبائی 252 میل تھی، جس کے لیے 453,600 سلیپرز درکار تھے، جس کے لیے 1859ء سے 1864ء تک دیودار کے 41,236 درختوں کی کٹائی کی گئی۔ پنجاب میں ریلوے ٹریک کی تعمیر کے لیے دریائے چناب اور دریائے راوی کے ارد گرد جنگلات کی کٹائی کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق 62-1861ء میں چناب ویلی سے 11,152 جب کہ راوی کے قریب سے 5,649 درختوں کی کٹائی ہوئی، جب کہ 63-1862ء کے دوران چناب سے 12,706 اور راوی ہل سے 6,083 دیودار کے درخت کاٹے گئے۔

اس کے بعد دہلی ریلوے کی تعمیر کی گئی۔ میرٹھ سے لے کر امرتسر تک 320 میل طویل ریلوے ٹریک بچھایا گیا۔ دہلی ریلویز کے لیے فی میل 2,000 سلیپرز یا 10,000 کیوبک فٹ لکڑی درکار تھی۔ چناں چہ 1863ء تا 1868ء تک دہلی ریلویز کے لیے 640,000 سلیپرز یا 3,200,000 کیوبک لکڑی درکار تھی۔ اس ریلوے ٹریک کے لیے دریائے بیاس کے جنگلات سے 400,000 کیوبک فٹ، دریائے ستلج کے جنگلات سے 1,000,000 اور دریائے جمنا کے جنگلات سے 1,400,000 کیوبک فٹ لکڑی درکار تھی، جس کے لیے بیاس سے 10,000 درخت، ستلج سے 25,000 درخت اور جمنا سے 35,000 درخت چاہئیں تھے۔ 66-1865ء کی پنجاب پراگریس رپورٹ میں درج ہے کہ ستلج میں صرف 21,167 فرسٹ کلاس درخت

ہیں، جب کہ بیاس میں صرف 5000 فرسٹ کلاس درخت دستیاب ہیں۔ اس لیے دہلی ریلوے ٹریک کی تعمیر کے لیے مذکورہ علاقہ جات کے جنگلات درختوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے تھے۔

دہلی ٹریک پر 68-1866ء کے دوران 205 میل سالانہ تعمیر کی جارہی تھی اور لکڑی کی قلت پیدا ہونے پر حکومت نے Forest Conservation پالیسی نافذ کر دی اور پنجاب میں 1864ء میں پنجاب فوریسٹ ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا، جب کہ ہندوستان کی سطح پر امپیریل فوریسٹ ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا۔ یہ محکمہ جات قائم کرنے کا بنیادی مقصد ریلویز کے لیے لکڑی کی فراہمی کو یقینی بنانا تھا اور ان محکمہ جات کی جانب سے نجی افراد کے لیے لکڑی خریداری پر پابندی عائد کر دی گئی۔ دوسری جانب نئی پالیسی کے نفاذ کے باوجود ریلوے کو لکڑی کی فراہمی کے لیے درختوں کی کٹائی جاری رہی۔ برطانوی سامراج کے زیر کنٹرول پنجاب کے علاوہ خود مختار ریاستوں میں موجود جنگلات کو بھی حکومت نے ٹھیکے پر حاصل کر لیا۔ ستلج ریجن (29) میں Ruler of Bussahir نے جنگلات پچاس سال کے لیے برٹش گورنمنٹ کے حوالے کر دیے۔ دریائے راوی کے قریب Ruler of Chamba نے اپنے علاقے کے جنگلات 20 سال کے لیے برطانوی سامراج کے سپرد کر دیے اور سالانہ 20,000 روپے ٹھیکہ وصول کیا گیا۔ برٹش گورنمنٹ نے ان جنگلات سے بھی لکڑی کی کٹائی شروع کی تا کہ ریلوے کی تعمیر کا کام معطل نہ ہو۔ (30)

ریلویز؛ وسائل کی لوٹ مار کا ذریعہ

ہندوستان کا وسیع و عریض ریل نیٹ ورک برطانوی سامراج نے کالونیل معاشی استحصال اور امپیریل فوجی تقاضوں کے تناظر میں بنایا۔ ریل کے تعمیراتی تصور میں نوآبادیاتی قبضے کو مستحکم کرنا اور برطانیہ کی معیشت کو مضبوط کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنیوں کو ریل میں سرمایہ کاری کے عوض کئی گنا منافع ادا کیا گیا اور بدلے میں ان کمپنیوں کے سرمائے کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا۔ ان ریل گاڑیوں میں یورپی افسران اور فوجی سفر کرتے یا پھر صرف مال بردار گاڑیاں ہی پٹریوں پر چلتیں۔ ریلویز میں ملازمتوں کی تقسیم میں بھی یورپی افراد کو ترجیح دی جاتی۔ پیسوں کی وصولیوں سے لے کر مال گاڑیوں کی نگرانی تک کے عملے میں یورپی افسران کو مقرر کیا جاتا، جب کہ بھاپ سے چلنے والے انجنوں میں کوئلہ اُنڈیلنے کی خطرناک نوکریوں میں ہندوستانیوں کو ترجیح دی جاتی۔ ہندوستان میں ریل نیٹ ورک دراصل برطانوی سامراج کی اس خطے میں معاشی لوٹ کھسوٹ کی علامت ہے۔ ریلویز کے ذریعے سے ہندوستانی معیشت کو زراعت پر جامد رکھا گیا اور نوآبادیاتی منصوبہ بندی کے باعث ریل ٹیکنالوجی کو بھی یہاں منتقل نہیں کیا گیا۔ تاریخی حقائق کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریلویز ہندوستان کے لیے تحفہ نہیں تھا، بلکہ وسائل کی لوٹ مار کے ساتھ بھوک پیدا کرنے والا ایسا جادوئی پہیہ تھا جس نے ہندوستان میں قحط سالی کو جنم دے کر لاکھوں افراد کو لقمۂ اجل بنایا گیا۔

----

www.rahimia.org

حوالہ جات وحواشی

1۔ Colonial Power and the Introduction of Railways in India (کالونیل پاور اینڈ دی انٹروڈکشن آف ریلویز ان انڈیا)ص: 04

2۔ سولھویں صدی میں جب شیر شاہ سوری نے جب ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو اس کی ترجیحات میں 2500 کلومیٹر طویل سڑک کی تعمیرِ نوتھی، جو کابل سے لے کر کلکتہ تک پھیلی ہے، تاکہ سرکاری پیغام رسانی اور تجارت کو مؤثر اور تیز تر بنایا جائے۔اس سڑک کے بارے میں روایت ہے کہ اس کا پہلے نام جرنیلی سڑک تھا جو بعد میں انگریزوں کے دورِ حکمرانی میں بدل کر جی ٹی روڈ یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ رکھا گیا۔

3۔ Colonial Power and the Introduction of Railways in India (کالونیل پاور اینڈ دی انٹروڈکشن آف ریلویز ان انڈیا)ص: 11، ستمبر 2009ء

4۔ الطاف، محمد: Colonialism, Technology and Social Control: A Study of Development of Railways in British North India ص: 17، ایم فل تھیسز ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری یونیورسٹی آف دی پنجاب، 2011ء۔

5۔ تھرور، ششی: But What about the Railways; The Myth of Britain Gift to India گارڈین لندن، 8/ مارچ 2017ء۔

6۔ Dan Bogart & Latika Chaudhary؛ Railways in Colonial India مئی 2012ء۔

7۔ لارڈ ڈلہوزی کا اصل نام James Andrew Broun-Ramsay تھا، ۳۵ سال کی عمر میں وہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ وہ 12/جنوری 1848ء سے 28/فروری 1856ء تک ہندوستان کا گورنر جنرل تعینات رہا۔

8۔ Dan Bogart & Latika Chaudhary؛ Railways in Colonial India مئی 2012ء۔

9۔ Staurt, Sweeney؛ Indian Railroading; Floating Railways Companies in 19th Century از اکنامک ہسٹری سوسائٹی جرنل،ص: 60، اگست 2009ء۔

10۔ Kerr, Ian؛ Building the Railways of the Raj from 1850 to 1900 از آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 1995ء۔

11۔ Dan Bogart & Latika Chaudhary؛ Railways in Colonial India ص:9، مئی 2012ء۔

12۔ تھرور، ششی: An Era of Darkness; The British Empire in India ؛ ص:207، الف بک کمپنی، نیو دہلی 2016ء۔

13۔ ارینسٹ، ولیم: India's Demand for Railways ،ص: 34، نیویارک؛ ایمز پریس، 1968ء۔

14۔ اینڈریو، ولیم: Indian Railways as Connected with British Empire in the East؛ ص: 27، فورتھ ایڈیشن، لندن، 1884ء

15۔ ایضاً، ص: lxxxviii-lxxx۔

16۔ کلائیو ڈیوے: Arrested Development in India; The Historical Dimensions؛ ص 139، منوہر پبلی کیشن، نیو دہلی 1988ء۔

www.rahimia.org

17۔ History of Indian Railways; Constructed & Corrected and in Progress till1923، ص: 145-47، گورنمنٹ آف انڈیا پریس 1924ء۔

18۔ تھرور، ششی: An Era of Darkness; The British Empire in India؛ ص: 213، الف بک کمپنی، نیو دہلی 2016ء۔

19۔ Sanyal, Nalinksha: Development of Indian Railways ص: 63، کلکتہ، یونیورسٹی آف کلکتہ 1930ء۔

20۔ Dan Bogart & Latika Chaudhary؛ Railways in Colonial India ص:10، مئی 2012ء

"Net earning (i.e., gross earnings minus working expenses) were paid into the treausry and rebated to the company. If net earnings as a proportion of capital outlay yielded less than the guaranteed return of 5 percent in any year, the Government compensated the company the difference up to 5 percent. Such guaranteed were treated as debt. When annual net earnings exceeded the guaranteed level , the company was required to repay any past guarantee payments by trasnsferring half of their surplus profits over 5 percent to the Government. After all past guarantee payments were paid off, the company received the entire surplus profits."

21۔ Clingingsmith, David & Williamson: India's De-Industrialization Under British Rule; New Ideas, New Evidences، نیشنل بیورو آف اکنامکس ریسرچ کیمبرج، جون 2004ء۔

22۔ James Foreman: Foreign Investment and Imperial Exploitation; Balance of Payments Reconstruction for 19th Century Britain India؛ ص: 366-67، اکنامک ہسٹری سوسائٹی، اگست 1989ء۔

23۔ Clingingsmith, David & Williamson: India's De-Industrialization Under British Rule; New Ideas, New Evidences ص: 30، نیشنل بیورو آف اکنامکس ریسرچ کیمبرج، جون 2004ء۔

24۔ C.C. Davies: The Problem of North West Frontier 1890-1908؛ ص: 18-36، کیمبرج پریس، 1932ء۔

25۔ R.A. Jhonson: Russian at the Gates of India, Planning the Defense of India 1885-1900، جرنل آف ملٹری ہسٹری، والیم 67، جولائی 2003ء۔

26۔ Forgotton Muslim Soldiers of World War I، بی بی سی لندن رپورٹ، 9 نومبر 2018ء۔

27۔ Pallavi Das: Colonialism and the Enviornment in India; Railways and De-forestration in 19th Century Punjab، ص: 42، جرنل آف ایشین افریکن سٹڈیز، ص 64، 2010ء۔

"It is found that the deodar timber is admirably adapted for railway sleepers, and every region in the hills, from the Indus to the Sutlej, is ransacked to provide the requisite supply. The resources of the Jehlum and

www.rahimia.org

Chenab and almost exhausted, and hitherto to forests on the Sutlej have been entirely neglected.... The forests close to the water edge have long since been cleared away, and it is only at a distance of a mile or more from the river base that trees are found."

28۔ ایضاً: ص 44

"The Enormous qunatity of timber alone required for sleepers on the Mooltan line... supposing the line to be completed in three years, the estimate is for a monthly supply of 1 or 12,000 sleepers for 36 months, or half a million of cubic feet per annum... Supposing a log to give on an average 40 cubic feet, we have here an annual demand for 12,500 logs... or of 37,500 in three years for sleepers alone. Now for the Amritsar line 32 miles long, irrespective of statiions, sidings, &c, 57,600 sleepers were required, and these are not yet all delievered, i.e. in about 18 months, and for that number about 5,000 trees only, yielding 40 cubic feet per long, were requisite..."

29۔ برطانوی سامراج نے 1901ء میں پنجاب اسٹیٹ ایجنسی قائم کی۔ اس ایجنسی میں خود مختار ریاستیں شامل تھیں جس میں پٹیالہ، بہاول پور، جند، کپورتھلا، نابھہ، بیلاس پور، چھامبا، فرید کوٹ، سرمُر اور سُکیت شامل ہیں، 1936ء میں برطانوی سامراج نے پنجاب کے Hilly علاقوں کو بھی پنجاب اسٹیٹ ایجنسی میں شامل کر دیا گیا۔

30۔ Pallavi Das: Railways and Colonialism and the Enviornment in India; De-forestration in 19th Century Punjab ص:42، جرنل آف ایشین افریکن سٹڈیز، ص 43، 2010ء۔

☆

www.rahimia.org

شخصیات

اپنی ذات میں اِک انجمن سی شخصیت

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ

تحریر: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

استاذِ مکرم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ (1997ء-1944ء)، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے تیسرے رئیس الجامعہ، خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کی روحانی کہکشاں کے مہرِ تاباں، مجلس دعوت و تحقیقِ اسلامی کراچی کے روحِ رواں اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ، اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ مدرّس، محقق، مؤلف، منتظم، مربی اور داعی جیسی کئی صفات کے حامل، گویا اپنی شخصیت میں کئی شعبوں کو سموئے ہوئے تھے۔

تنہائیوں کی رُت میں بھی لگتا تھا مطمئن
وہ شخص اپنی ذات میں اِک انجمن سا تھا

حضرت مولانا شہیدؒ کی پہلی زیارت کا متعین وقت علم میں نہیں، 1969ء میں حفظِ قرآن کی تکمیل کے بعد والدِ محترم حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ کی معیت میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن (بعد میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) کراچی آنا جانا شروع ہوا تو رفتہ رفتہ وہاں کے اساتذہ کرام سے واقفیت ہوتی چلی گئی۔ ان کا وہ سراپا تو نظروں میں ہے، جب جامعہ کی وسیع و عریض جامع مسجد میں ان کے نکاح کی پُر وقار تقریب (۲۸/ رجب المرجب ۱۳۹۲ھ بروز جمعۃ المبارک/ 8/ستمبر 1972ء کو) منعقد ہوئی اور محدث العصر حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ (1978ء-1908ء) نے اپنی سب سے چھوٹی صاحبزادی کا ان سے نکاح کا خطبہ مسنون ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت حضرت مولانا شہیدؒ عربی لباس میں ملبوس جوان رعنا تھے۔ اسی عرصے میں یہ بات بھی علم میں آئی کہ دارالعلوم نانک واڑہ کراچی کے ابتدائی سالوں میں وہ وہاں زیرِ تعلیم رہے اور والدِ محترمؒ سے بھی انھوں نے ابتدائی کتب کی تعلیم پائی۔ ان کے رفقائے تعلیم میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ صدر دارالعلوم کراچی کے صاحبزادگان مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی بھی شامل تھے۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس رہتے اور نشست و برخاست میں کپڑوں کی سلوٹوں تک کا خیال رکھتے۔ طبیعت میں نظافت اور یکسوئی، گفتگو میں نرم روی، خندہ پیشانی اور معاملات پر عقابی نگاہیں ان کی پہچان تھی۔

مولانا شہیدؒ کا علمی مزاج اور تحقیقی کام

حضرت مولانا شہیدؒ کا مزاج بنیادی طور پر علمی تھا، چناں چہ اپنے ضروری مشاغل کے علاوہ ان کا تمام وقت تصنیف و تدریس

www.rahimia.org

کے لیے وقف تھا۔ سنن ترمذی کے ''و فی الباب'' پر ان کا تحقیقی کام ''کشف النّقاب عمّا یقوله التّرمذی و فی الباب'' کے عنوان سے ایک شاہ کار حیثیت رکھتا ہے۔

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ (892ء) اپنی کتاب ''السّنن'' میں ایک عنوان قائم کر کے اس کے تحت ایک صحابی کی حدیث کا مکمل متن ذکر کرتے ہیں، پھر اس موضوع سے متعلق دیگر صحابہ کرامؓ کی احادیث کی طرف رہنمائی کے لیے ان صحابہؓ کے اسمائے گرامی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ''وفی الباب'' کا عنوان اختیار کرتے ہیں۔ ان صحابہؓ کی متعلقہ احادیث کی سند و متن کی تحقیق و تعلیق کے لیے حضرت مولانا شہیدؒ نے یہ کام حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی ایما پر شروع کیا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا شہیدؒ نے سب سے پہلے ''سنن ترمذی'' کی کتاب الطهاره پر کام کا آغاز کیا اور 1981ء میں کراچی یونیورسٹی سے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ یہ کام حضرت بنوریؒ کی زیر نگرانی مکمل کرنا چاہتے تھے، مگر ان کی رحلت کے سبب پروفیسر ڈاکٹر امتیاز احمد سابق ڈین کلیہ معارف اسلامیہ کراچی یونیورسٹی کے اشراف میں تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور بعدازیں اشاعت پذیر ہوا۔ حضرت مولانا شہیدؒ نے بعدازیں ''وفی الباب'' کے اس عنوان کو اپنے تحقیقی پروجیکٹ کا اس طرح سرنامہ بنایا کہ ''کشف النّقاب عمّا یقوله التّرمذی و فی الباب'' کے عنوان سے کئی جلدوں پر مشتمل اس کتاب کا مسودہ تیار ہوگیا۔ مولانا شہیدؒ کی زندگی میں اس کی پانچ جلدیں اشاعت پذیر ہوچکی تھیں اور ابھی حال ہی میں چھٹی اور ساتویں جلدیں طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔ واضح رہے کہ حضرت بنوریؒ کو بھی ''سنن ترمذی'' سے خاصا شغف تھا، چناں چہ ''معارف السّنن'' کے عنوان سے ان کی شرح نے عرب و عجم کے علمی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل کی۔

مزید برآں حضرت مولانا شہیدؒ نے ''سنتِ نبویہ اور قرآن کریم'' کے عنوان سے اردو میں اور ''السّنّة النّبوية و مكانتها فی ضوء القرآن الكريم'' عربی میں تالیف کی ہیں۔ نیز مولانا شہیدؒ نے حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے منتشر علمی اور تحریری کام کو یک جا کیا اور اس پر تعلیقات لکھیں، جیسے القصائد البنّوریه، المقدّمات البنّوریه، مجرّبات بنّوریه، جامعه دیوبند الاسلامیه فی ضوء المقالات البنّوریه اور ماہنامہ بینات میں شائع ہونے والے اداریے ''بصائر و عبر'' دو جلد وغیرہ۔

اس کے علاوہ خاص طور پر علمائے عرب کی ایسی عربی کتب کا ترجمہ آپؒ کا پسندیدہ مشغلہ تھا، جن سے اُمتِ مسلمہ کی اصلاح مقصود ہوتی، چناں چہ ایسی کتب و رسائل کا بڑا مطبوعہ ذخیرہ ان کے لیے صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سے چند کتب کے نام درج ذیل ہیں:

1۔ اسلام اور تربیتِ اولاد	2۔ اسلام اور شادی	3۔ جنت کی چالیس راہیں
4۔ علماء، مبلغین اور مجاہدین کے نام	5۔ قلب	6۔ اطاعتِ والدین
7۔ جنت کی نعمتیں اور ان تک پہنچنے کا راستہ	8۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے نام	9۔ مسلمان بچے اور فرنگی تعلیم گاہیں
10۔ جنت	11۔ دوزخ	12۔ چالیس حدیثیں
13۔ مجموعہ سیرت الرسول	14۔ مسلمان نوجوان	15۔ ہمارا معاشرہ
16۔ غیرت مند مؤمن باپ کے نام	17۔ اصلاحِ معاشرہ اور اسلام	18۔ راہِ ہدایت و عمل

www.rahimia.org

19۔ مقدس باتیں 20۔ رسولِ اکرمؐ کی پچپن وصیتیں 21۔ نصیحتیں اور وصیتیں
22۔ جہاد 23۔ اسلامی آداب معاشرت
24۔ شادی میں رکاوٹیں اور اسلام کی روشنی میں ان کا حل 25۔ مناجات سید احمد العلاوی
26۔ مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی اردو کتاب ''تعلیم الاسلام'' کا عربی ترجمہ

عربی کتب کے اُردو تراجم پر مفید حواشی

حضرت مولانا شہیدؒ کا اصلاحی ذوق گو عربی میں لکھی گئی اصلاحِ معاشرہ سے متعلق کتب کے تراجم کا تھا، لیکن جہاں انھوں نے مترجم کے مافی الضمیر کو سلیس اُردو زبان میں منتقل کیا، وہیں اس کا بھی اہتمام رکھا کہ جہاں کسی تعلیق کی ضرورت محسوس ہو تو اس کو بھی قارئین کی رہنمائی کے لیے درج کر دیا جائے، مثلاً شیخ عبداللہ ناصح علوان نے عقیقہ کی عدمِ مشروعیت کی نسبت فقہائے حنفیہ کی طرف کی تو حضرت مولانا شہیدؒ نے اس پر یہ تعلیق درج کی:

''مؤلف کا فقہائے حنفیہ کی طرف عقیقہ کے مشروع نہ ہونے کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ حنفیہ اس کے سنتِ مؤکدہ اور واجب ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ استحباب کے وہ بھی قائل ہیں، جیسا کہ شامی (6/336) **عمدة القاری** (9/711) اور **اختلاف الفقهاء** (5/89) وغیرہ کتب میں صراحتاً مذکور ہے۔''(1)

ایک اور مقام پر شیخ علوان نے ذکر کیا کہ عقیقہ میں شرکت جائز نہیں تو اس پر حضرت مولانا شہیدؒ نے یوں تبصرہ کیا:

''حنفیہ کے ہاں اگر ثواب اور قربت کی نیت ہو تو ایک جانور میں شرکت ہو سکتی ہے، جیسے کسی کی نیت قربانی کی ہو اور کسی کی عقیقہ کی۔ اسی طرح ایک گائے یا اونٹ میں سات بچوں کے عقیقے بھی ہو سکتے ہیں۔ تفصیل کے لیے **شامی** (5/229) وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔''(2)

اسی طرح شیخ محمد بن سالم بیجانی نے اپنی کتاب ''**اصلاح المجتمع**'' میں ذکر کیا کہ:

''ہمارے ہاں یتیم کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔''

تو حضرت مولانا شہیدؒ نے ترجمہ کے حاشیے میں اس کی وضاحت درج کی کہ:

''یہ شوافع کا مذہب ہے۔ حنفیہ کے ہاں بچے کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، جس طرح اس پر نماز، روزہ اور حج فرض نہیں ہے۔''(3)

شیخ بیجانی نے وضو اور غسل سمیت عبادت کو تقریباً ساٹھ انواع و اقسام میں نیت کے فرض ہونے کا ذکر کیا تو حضرت مولانا شہیدؒ نے حاشیے میں وضاحت کی کہ:

''یہ شوافع حضرات کا مذہب ہے۔ حنفیہ کے یہاں وضو و غسل بغیر نیت کے بھی ہو جاتا ہے۔''(4)

شیخ بیجانی نے **رمادہ** (راکھ) والے سال کا ذکر کیا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس سال چوری کی سزا اس لیے موقوف کی تھی کہ لوگ نہایت سخت قحط اور فقر و فاقہ میں گرفتار تھے اور اس درجہ کو پہنچ گئے تھے جس درجہ میں مالدار کے مال میں

غریب و فقیر کا حق ثابت ہو جاتا ہے اور حضرت عمرؓ نے اس ضرورت و حاجت کو ان شبہات میں سے ایک شبہ قرار دیا تھا، جس کی وَجہ سے حدود و سزا کو روک دیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا شہیدؒ نے اس کی وضاحت میں تحریر کیا کہ:

حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور میں ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں قحط سالی کا دور دورہ ہوا جس میں بہت سے انسان و مال مویشی ہلاک ہوگئے تھے۔ انھوں نے تاج العروس (2/357) کے حوالے سے لکھا ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مسلسل قحط سالی کی وَجہ سے زمین اور درختوں کا رنگ راکھ کی طرح ہوگیا تھا، اس لیے اسے **"عام الرمادہ"** (راکھ والا سال) کہتے ہیں۔(5)

شیخ بیجانی نے زنا کی سزا میں سو کوڑوں اور ایک سال کے لیے اپنے وطن سے ملک بدر کرنے کا ذکر کیا تو اس پر حضرت مولانا شہیدؒ نے تبصرہ کیا کہ:

''حنفیہ کے ہاں ملک بدر کرنا ''حد'' میں داخل نہیں ہے۔ اگر امام (حکومت) اسے مصلحتاً مناسب سمجھے تو تعزیراً ایسا کرسکتا ہے، خواہ ملک بدر کرے یا قید کرے۔''(6)

شیخ بیجانی نے کھانے کے آداب کے ضمن میں اس خیال کا اظہار کیا کہ کھانا کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی ایسے لوگوں کے سامنے انگلیاں نہ چاٹے جو اسے ناپسند کرتے اور برا سمجھتے ہوں تو حضرت مولانا شہیدؒ نے اسے فاضل مؤلف کی ذاتی رائے قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

''کسی کے ناپسند کرنے کی وَجہ سے سنت کو نہیں چھوڑا جاسکتا، بلکہ ایسے مواقع پر اس متروکہ سنت کے احیا کا بھی اجر ملے گا۔''(7)

شیخ بیجانی نے اس نفع کے بارے میں جو بینک اور کرنسی کا کاروبار کرنے والے ادارے ان لوگوں کو دیتے ہیں جو مال و دولت کو ان کے یہاں ودیعت (امانت) کے طور پر رکھواتے ہیں، یہ رائے دی ہے کہ: ''اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس تفصیل کے موافق ہو، جسے بینکوں اور ملکی و غیر ملکی بینکوں کے حالات سے باخبر لوگ جانتے ہیں۔''

اس سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت مولانا شہیدؒ نے واضح کیا کہ:

''بینکوں سے جو نفع عام طور سے مختلف کھاتے داروں کو دیا جاتا ہے، وہ سود ہی ہوتا ہے، البتہ نام بدل دیا جاتا ہے، اس لیے اس طرح کے پیسوں کا نفع کے نام سے لینا سود لینے ہی میں شامل ہوگا، جو قطعاً حرام ہے۔''(8)

شیخ بیجانی نے تحریر کیا کہ:

''اگر کوئی شخص نماز کی پہلی صف میں ہو اور وہ سمجھ دار اور عقل مند بھی ہو تو اس کے لیے یہ مکروہ ہے کہ وہ کسی اَور وَجہ سے پیچھے ہٹ جائے اور دوسرے کو صف میں جگہ دے دے اور نیکیوں میں ایثار کرنا مکروہ ہے، خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہوں۔''

اس پر حضرت مولانا شہیدؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ:

''یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے، جب کہ امام ابو حنیفہؒ کے یہاں ایسا کرسکتا ہے اور اس صورت میں اسے صفِ اول

میں ہی نماز پڑھنے کا اجروثواب ملے گا اور ساتھ ہی اس دوسرے شخص کو صفِ اول میں جگہ دلانے اور مسلمان کے اعزاز واکرام کے اجر کا بھی مستحق ہوگا۔ (9)

شیخ بیجانی نے اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ نماز عاقل بالغ مسلمان سے موت کے علاوہ کسی بھی صورت ساقط نہیں ہوتی، تحریر کیا ہے کہ:

''اگر کوئی شخص بیمار ہو یا کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔ اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو پہلو پر لیٹے لیٹے پڑھے گا۔ اگر پہلو پر بھی نہ پڑھ سکے تو کمر کے بل چت لیٹ کر پڑھے گا۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو سر یا پلکوں کے اشارے سے پڑھے گا۔ پھر دل سے ارکان کو ادا کر کے پڑھے گا۔''

اس موضوع پر حضرت مولانا شہیدؒ نے یہ وضاحت کی کہ:

''حنفیہ کے یہاں اگر سر سے بھی اشارہ نہ کر سکے تو نماز مؤخر کرے گا۔ تندرستی کے بعد قضا کرے گا یا پھر اگر موقع نہ ملے تو کفارہ دیا جائے گا۔''(10)

اگر امام (حکومت) لوگوں سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کرے تو اس حوالے سے شیخ بیجانی نے یہ رائے دی ہے کہ:

''اس کو زکوٰۃ دینا واجب ہے، خواہ وہ اس کو غلط جگہوں پر خرچ کرنے کی تصریح ہی کیوں نہ کرے۔''

اس سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت مولانا شہیدؒ نے لکھا کہ:

''یہ صاحبِ کتاب کی رائے ہے، ورنہ فتویٰ یہ ہے کہ اگر حاکم اسے صراحتاً غلط مصرف میں خرچ کرتا ہو تو اسے دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔''(11)

شیخ علوان نے مستحب روزوں میں ایامِ بیض کے تین روزوں کا ذکر کیا تو اس کی وضاحت میں حضرت مولانا شہیدؒ نے تحریر کیا کہ:

''ایامِ بیض چاند کے ہر مہینہ کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ کو کہتے ہیں۔ ان کو ''بیض'' اس لیے کہتے ہیں کہ ان دنوں میں آسمان چاند کی روشنی سے روشن ہوتا ہے۔''(12)

شیخ علوان نے ایک روایت ذکر کی کہ رُکانہ (پہلوان) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کُشتی میں پچھاڑنے کا چیلنج دیا اور کہا کہ اگر آپؐ جیت گئے تو میں آپؐ کو بکری دوں گا ورنہ آپؐ مجھے دیں گے۔ چناں چہ کُشتی میں رسول اللہؐ نے اسے پچھاڑ دیا تو اس نے دوبارہ مقابلے کی دعوت دی، آپؐ نے دوبارہ اسے پچھاڑ دیا۔ پھر اس نے تیسری بار مقابلہ کے لیے کہا تو آپؐ نے تیسری مرتبہ بھی پچھاڑ دیا۔ اس پر رکانہ کہنے لگا کہ میں بکریوں کے بارہ میں گھر والوں کو کیا جواب دوں گا؟ پھر خود ہی کہنے لگا کہ یوں بتاؤں گا کہ ایک بکری کو تو بھیڑیا کھا گیا اور دوسری بھاگ گئی، لیکن تیسری کے بارے میں سمجھ نہیں آ رہی۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''ہم یہ نہیں کر سکتے کہ تمھیں پچھاڑ بھی دیں اور تم پر تاوان و ڈنڈ بھی آ جائے۔ اس لیے تم اپنی بکریاں لے لو۔''

اس حوالے سے حضرت مولانا شہیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''یہ واقعہ لازمی طور پر جوئے کے حرام ہونے سے قبل کا ہے اور اس موقع پر بھی آپ نے دیکھ لیا کہ نبی کریمؐ نے

www.rahimia.org

ان صاحب کی بکریاں انھیں کو واپس لوٹا دیں اور خود نہ لیں۔ گویا کہ جوئے کی حرمت کے لیے پہلے ہی سے ایک یہ تمہید تھی۔''(13)

شیخ علوان نے ایسے جانور کو حلال قرار دیا ہے، جس کو پستول، بندوق یا رائفل وغیرہ کی گولی سے مارا جائے۔ اس لیے کہ گولی جسم میں تیر و نیزے سے زیادہ سختی سے نفوذ کرتی ہے، مگر حضرت مولانا شہیدؒ نے اس کو مصنف کی انفرادی رائے قرار دیتے ہوئے ذکر کیا کہ:

''ائمہ کرام کے یہاں ایسا جانور حرام ہے۔''(14)

شیخ علوان نے ذکر کیا ہے کہ مردوں کے لیے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے، بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے۔ اس حوالے سے حضرت مولانا شہیدؒ نے فقہائے حنفیہ کا مؤقف ذکر کیا کہ:

''وہ اس کے قائل ہیں کہ انگوٹھی کا وزن ایک درہم (جو سوا تین گرام کے برابر ہے) سے زائد نہ ہو۔''(15)

حدیثِ نبویؐ میں مذکور ہے کہ:

''مرنے والے کو اس کے گھر بار کے لوگوں کے رونے کی وَجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔''(16)

اس کی وضاحت میں حضرت مولانا شہیدؒ ذکر کرتے ہیں کہ:

''رونے سے مراد نوحہ کرنا اور بلند آواز سے آہ و بکا کرنا ہے اور اگر مرنے والا اس طرح رونے کی وصیت کرے یا اس پر راضی ہو تو اس رونے کی وجہ سے اسے عذاب دیا جائے گا۔''(17)

شیخ علوان نے تربیت کے ان مفید وسائل و اسباب میں جو بچے کے تعلیمی معیار کو بڑھانے اور اس کی ثقافت کو مستحکم کرتے ہیں، تخیلاتی مناظر پر مشتمل فلموں کا ذکر کیا ہے، جن میں علمی حقائق، تاریخی کارناموں اور جغرافیائی مواقع پر مشتمل تربیتی رہنما اصول پیش کیے گئے ہوں۔ حضرت مولانا شہیدؒ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اور اس کو صاحبِ کتاب کی رائے قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''محققین سینما، تھیٹر، وی سی آر وغیرہ سب کو ناجائز قرار دیتے ہیں کہ گناہ ہر صورت میں گناہ ہی رہتا ہے، خواہ اس سے مقصد کچھ بھی ہو۔''(18)

جامعہ علومِ اسلامیہ کے علمی مزاج کی بحالی

حضرت مولانا شہیدؒ نے اپنے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے اہتمام کے دورانیے (1997ء-1991ء) میں اس امر کی بھرپور کوشش کی کہ جامعہ اپنے اس علمی مزاج پر رواں دواں ہو، جو اس کے بانی محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوریؒ کے پیش نظر تھا۔ اس لیے انھوں نے ان عناصر کی حوصلہ شکنی کی، جو غیر تعلیمی اور ہنگامی سرگرمیوں کے لیے جامعہ کی چار دیواری کو استعمال کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ذہن بہت واضح تھا کہ دورانِ تعلیم طلبا کا محور صرف اور صرف کتب بینی، اساتذہ سے رہنمائی، بزرگوں سے تعلق اور باہمی مفید تبادلہ خیالات ہونا چاہیے۔ اس عرصے میں ان کو کسی عملی و ہنگامی سرگرمی میں حصہ نہیں لینا

www.rahimia.org

چاہیے، خواہ وہ بہ ظاہر کتنی ہی مذہبی کیوں نہ ہو۔

اس سلسلے میں ان کے لیے نمونۂ عمل ان کے مربی شیخ الجامعہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ تھے۔ 1974ء میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت عروج پر تھی اور مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کی سربراہی بھی علامہ بنوریؒ کے پاس تھی، جس کے سبب ان کو مسلسل اسفار اور حکومتی و غیر حکومتی شخصیات سے مذاکرات کی مستقل مصروفیت درپیش رہی۔ اس دوران ملک بھر میں جلسوں اور جلوسوں نے بڑی جذباتی فضا قائم کی ہوئی تھی، جس سے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے علمی ماحول کا متأثر ہونا قرینِ عقل تھا، لیکن شیخ الجامعہ نے تدریسی عمل کو کسی صورت معطل نہیں ہونے دیا اور طلبا کو تعلیمی نظام الاوقات کا پابند رکھا۔ اس دوران کچھ جذباتی طلبا نے شیخ الجامعہ کے حوالے سے ''مُداھنت'' کی افواہ طرازی بھی کی، اس پر شیخ الجامعہ علامہ بنوریؒ نے طلبا سے ایک خصوصی خطاب بھی کیا اور واضح کیا کہ وہ آلِ رسولؐ ہونے کے ناطے اور محدثِ وقت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی شاگرد ہونے کے تعلق سے بھی دیگر حضرات کے مقابلے میں مسئلہ ختمِ نبوت سے نہایت جذباتی تعلق رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے جذبے سے سرشار ہیں، مگر طلبا کے غیر ضروری استعمال کو اس مسئلے کے حل میں کسی طور پر مفید تصور نہیں کرتے۔ اور جب بھی اس کی افادیت ان کے سامنے آئے گی، وہ مدرسے کے مفاد کو ختمِ نبوت کے مقصد پر قربان کرنے میں کسی صورت نہیں ہچکچائیں گے۔

بعد ازیں علامہ بنوریؒ نے والدِ محترم حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ کو بہ طورِ ناظمِ تعلیمات جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن ذمہ داری سونپی کہ وہ طلبا کے حلقہ جات تشکیل دیں، تاکہ نظم وضبط کے ساتھ طلبا مختلف مساجد میں نمازِ مغرب تا نمازِ عشا جا کر نمازی حضرات کے سامنے قادیانی مسئلے کی وضاحت کریں اور مسلمانوں کو ختمِ نبوت کے مسئلے کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ یوں طلبا کو اس مسئلے کے حوالے سے اس تحریک میں علمی کردار ادا کرنے کا ایک موقع مہیا کیا، جس سے طلبا کی ہیجانی کیفیت بھی معمول پر آ گئی اور تدریسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔

حضرت مولانا شہیدؒ نے جامعہ کو اس کے بانی کے مقاصد کے مطابق علمی مزاج پر لانے کی بھرپور جدوجہد کی، جو حقیقتاً مشکلات سے بھرپور تھی، مگر اس سے جامعہ کو اپنی علمی فضا بحال کرنے میں بھرپور مدد ملی۔ درحقیقت علمی سرگرمی اور تحریکی کردار کے تقاضے عام طور پر ہم آہنگ نہیں ہو پاتے، اس لیے ان میں ترتیب اور ترجیح کو ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شہیدؒ کو یہ چیلنج وِرثے میں ملا تھا کہ شہر کی مذہبی تحریکی سرگرمیوں نے شہر میں مرکزی حیثیت کے حامل ہونے کے سبب جامعہ اور اس کی جامع مسجد کو اپنا موزوں مرکز تصور کیا ہوا تھا، جس کے سبب کئی بار جامعہ کو ان سرگرمیوں کے سبب عملی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حضرت مولانا شہیدؒ ان مشکلات کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، بلکہ ان کے ناگوار اثرات کو بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے، اس لیے آپؒ نے عملی اقدامات کر کے جامعہ کی علمی فضا کو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی اور غالبًا یہی کوشش، علم دشمن اور امن شکن عناصر کے ردِعمل کا سبب بنی اور ان کے ہاتھوں انھوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ رَحِمَہ اللّٰہ رَحمۃً وَّاسِعۃً شَامِلَۃً کَامِلَۃً.

حضرت بنوریؒ اور حضرت رائے پوریؒ سے مولانا شہیدؒ کا تعلق

دو شخصیات کے حوالے سے حضرت مولانا شہیدؒ کی فنا کی کیفیت کا ایک عالم شاہد ہے؛ ایک حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ اور

www.rahimia.org

دوسرے حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری (حضرت رائے پوری ثالث) نَوَّرَ اللّٰہُ مَرقَدَیھُمَا۔ حضرت رائے پوری ثالثؒ کے سانحۂ ارتحال پر ماہنامہ ''بینات'' (کراچی) میں شائع ہونے والا ان کا تأثراتی مضمون اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایک حقیقی سالک کو اپنے شیخ سے کس طرح کا تعلق ہوتا ہے اور وہ کس طرح اس تعلق کے سبب تربیت کے مدارج بڑی سُرعت سے طے کرتا ہے۔ اسی طرح ان کے حضرت رائے پوری ثالثؒ سے متعلق مکاتیب بھی اس گہرے تعلق کی واضح غمازی کرتے ہیں۔ (ان میں کچھ مکاتیب حضرت رائے پوری ثالثؒ کے نام براہِ راست ہیں اور چند مکاتیب حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ (حضرت رائے پوری رابعؒ) کے نام ہیں، جو حال ہی میں ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ لاہور کے مجلّہ ''شعور وآگہی'' میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں)۔ حضرت رائے پوری ثالثؒ خلافت واجازت کے حوالے سے نہایت محتاط مزاج رکھتے تھے، اس لیے ان کے مجازین کی فہرست نہایت مختصر ہے، ان میں حضرت مولانا شہیدؒ کا شامل ہونا ان کے بلند مقامِ طریقت کی واضح ترجمانی کرتا ہے۔

شیخ عبداللہ ناصح علوان کی کتاب ''تربیة الأولاد فی الإسلام'' کی کتاب کے ترجمے کے پیش لفظ میں حضرت مولاناؒ نے قارئین سے صاحبِ کتاب کے لیے، اپنے لیے اور اپنے جلیل القدر والدین اور برادرِ معظم کے لیے دعا کی درخواست کے ساتھ ساتھ اپنی دونوں محبوب شخصیات کے لیے بھی دعا کا تقاضا ان الفاظ میں کیا:

> ''میرے مربی و شیخ اور روحانی والد علامۃ العصر حضرت مولانا علامہ محمد یوسف بنوریؒ کو، جن کی توجہات عنایات، نظرِ کرم، دعاؤں، سرپرستی اور شفقت ومحبت نے مجھے یہ سلیقہ سکھایا کہ علما کی مجلس میں بیٹھ سکوں، طلبا کے ساتھ رابطہ قائم رکھ سکوں اور دین کا ادنیٰ خادم بن سکوں اور میرے مربی و شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مدظلہٗ (یہ تحریر 1988ء کی ہے، جب حضرت رائے پوری ثالثؒ حیات تھے) جن کی توجہ وصحبت اور تربیت نے میرے لیے خود کو پہچاننے اور اپنے ربّ کی معرفت وشناسائی کا راستہ ہموار کیا''۔ (19)

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ سے گہری مودّت ومحبت

حضرت رائے پوری ثالثؒ سے اسی والہانہ تعلق کے سبب حضرت مولانا شہیدؒ کو حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے خلیفہ مجاز، حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری کے خلف الرشید (بعدازاں جانشین) اور بانی وسرپرست جمعیت طلبائے اسلام وتنظیم فکرِ ولی اللّٰہی پاکستان، حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ (حضرت رائے پوری رابعؒ) سے بھی گہری مودّت ومحبت تھی۔ 1974ء میں حضرت رائے پوری رابعؒ کا سفرِ کراچی ہوا، اس سفر میں حضرت مولانا مفتی محمود (ناظمِ اعلیٰ جمعیت علمائے اسلام) کے علاوہ جمعیت طلبائے اسلام کے مرکزی وصوبائی قائدین میں سے سیّد مطلوب علی زیدی، میاں محمد عارف، حافظ محمد طاہر اور عبدالمتین چوہدری وغیرہ بھی ہم رکاب تھے۔ اس دوران آپؒ نے جامعہ کے مغرب میں موجود وسیع احاطے میں (اس وقت یہاں مجلس دعوت وتحقیقِ اسلامی اور جامعہ کی دیگر عمارتیں قائم ہیں) جمعیت طلبائے اسلام کراچی ڈویژن کے ایک روزہ کنونشن میں بھی خصوصی طور پر شرکت کی، جس میں جے ٹی آئی کے ڈویژنل عہدے داروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ (20) ان ایام میں حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے دوبدو سنجیدہ سیاسی گفتگو کا ایک فاصلہ سے مشاہدے کا موقع بھی ملا۔ (21) اس

www.rahimia.org

سفر میں حضرت رائے پوری رابعؒ کی جمشید روڈ نمبر 3 پر قائم جمعیت طلبائے اسلام کے مقامی دفتر میں طلبا کے ساتھ فکری نشستیں رہیں۔ ان میں حضرت رائے پوریؒ کا موضوعِ سخن اس مذہبی رویے پر سخت تنقید ہوا کرتا تھا کہ مذہب کو چند عبادات و رسوم تک محدود کرکے سیاست اور اجتماعیات کی نفی کی سوچ پروان چڑھائی جارہی ہے۔ اسی طرح کی تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں کو ہی جہاد کا متبادل قرار دے کر اس کے مفہوم کو مسخ کیا جارہا ہے۔ واضح رہے ان دنوں حضرت رائے پوری رابعؒ کی سرپرستی میں ملک بھر میں جمعیت طلبائے اسلام پاکستان کی طرف سے نماز اور جہاد کی اہمیت کے حوالے سے عوامی بیداری کے لیے آیات، احادیث اور اقوالِ سلف پر مشتمل کیلنڈرز کی اشاعت بھی کی گئی اور ان کو مساجد و دفاتر میں آویزاں کرنے کی مہم چلائی گئی۔ کس قدر اندوہ ناک حقیقت ہے کہ دو دہائیوں بعد مفاد پرست عناصر نے اپنے گھٹیا مقاصد کے تحت حضرت رائے پوری رابعؒ اور ان کے حلقہ فکر پر اس بہتان طرازی کی مہم چلائی کہ وہ نماز اور جہاد کی اہمیت کے منکر ہیں، جس سے بعض مذہبی حلقے بھی اپنی سادگی اور دوسروں پر اندھے اعتماد کی عادت کے سبب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فإلیٰ اللّٰہِ المشتکیٰ (اللہ سے ہی اس کی شکایت ہے)۔

حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ کا دفاع

حضرت رائے پوری رابعؒ کے ان افکار وخیالات کا ان دنوں میں جامعہ میں بہت چرچا ہوا اور کئی حلقوں میں ہلچل بھی پیدا ہوئی، جس کا کھل کر ردِعمل 1976ء میں آیا۔ چناں چہ ان دنوں کچھ عناصر نے شیخ الجامعہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ کو بھی حضرت رائے پوری رابعؒ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی اور حضرتؒ کی سرگرمیوں کو مدرسے کے معمولات کے لیے خطرہ قرار دے کر ناسازگار ماحول بنانے کی سعیٔ نامشکور انجام دی، حتیٰ کہ اس سے فوری تأثر لیتے ہوئے شیخ الجامعہؒ نے طلبا کے اجتماع کا انعقاد کیا، جس میں انھوں نے سیاسی گروہوں پر تنقید بھی کی تھی اور ان کی گفتگو کو بالواسطہ حضرت رائے پوری رابعؒ سے متعلق سمجھا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت حضرت رائے پوری رابعؒ لاہور واپسی کے لیے کراچی ریلوے سٹیشن پر تھے اور حضرت مولانا شہیدؒ ان کو الوداع کہنے کے لیے ان کے ہمراہ تھے۔ مولانا شہیدؒ جب اسٹیشن سے واپس جامعہ تشریف لائے تو اس صورتِ حال کا علم ہوکر انھیں شدید افسوس ہوا۔ چناں چہ شیخ الجامعہ حضرت بنوریؒ سے بالمشافہ ملاقات کرکے حقائق کی وضاحت کی، جس پر شیخ الجامعہؒ نے بعض حضرات کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کے نتیجے میں اپنے فوری ردِعمل پر نہ صرف اپنے تأسف کا اظہار کیا، بلکہ حضرت رائے پوری رابعؒ کے نام اپنے مکتوب میں اس حوالے سے وضاحت بھی کی۔

طلبا کے سامنے حضرت رائے پوری رابعؒ کی عظمت کا بیان

انھی دنوں میں حضرت مولانا شہیدؒ نے ''مقاماتِ حریری'' کے درس میں حضرت رائے پوری رابعؒ کی فکری جدوجہد پر روشنی ڈالی اور اس امر پر بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا کہ:

> ''وہ عظیم خانقاہ کے جلیل القدر مشائخ کے خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود دینِ حق کی تبلیغ و تنظیم کے لیے اپنے آپ کو مٹائے ہوئے ہیں اور مشیخت کے زُعم سے کوسوں دور کالج اور یونیورسٹی کے نوجوانوں تک رسائی حاصل کرکے ان کو اپنے سچے بزرگوں کا راستہ متعارف کرانے کے لیے ہمہ وقت مُستعد رہتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس دن حضرت مولانا شہیدؒ کے اظہارِ خیال نے ہم طلبا کے دلوں میں حضرت رائے پوری رابعؒ کی عظمت میں مزید اضافہ کر دیا۔ **رفع اللّٰہ درجاتھما فی العِلّیّین۔**

حضرت اقدس رائے پوری ثالثؒ کے جامعہ میں قیام پر مولانا شہیدؒ کی کیفیت

حضرت مولانا شہیدؒ کو مشائخِ رائے پور سے جو تعلقِ خاطر تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں، بلکہ شاید اس کے بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب بھی مشکل ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ (حضرت رائے پوری ثالث) 1978ء میں کراچی تشریف لائے اور آپؒ کا جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے مہمان خانے میں طویل قیام ہوا۔ حضرت بنوریؒ کی وفات کے بعد آپؒ کا پہلا سفرِ کراچی تھا، جس سے جامعہ کے اساتذہ کی دل جوئی مقصود تھی۔ اس لیے کہ جامعہ کے اکابر اساتذہ آپؒ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، ان میں حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی (تب ناظمِ اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ)، حضرت مولانا مفتی ولی حسن (شیخ الحدیث و رئیس دارالافتا جامعہ علومِ اسلامیہ)، اساتذۂ حدیث؛ حضرت مولانا محمد بدیع الزمان، حضرت مولانا سیّد مصباح اللّٰہ شاہ اور حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمہم اللّٰہ نمایاں تھے۔ ہر روز نمازِ مغرب کے بعد حضرت رائے پوری ثالثؒ طویل نوافل میں مصروف رہتے اور ذاکرین ذکر میں مشغول رہتے۔ اس دوران کسی دن حضرت رائے پوری رابعؒ سے کوئی نوجوان ملنے آ پہنچتا تو حضرت اپنے معمولات کو ایک طرف رکھ کر جامع مسجد بنوری ٹاؤن کے صحن میں فروکش ہو کر اس کی فکری و دینی تشنگی مٹانے کا اہتمام کرتے۔ نمازِ عشا کے بعد کراچی کے مختلف مقامات پر احباب کی طرف سے دعوتِ عشائیہ میں حضرت رائے پوری ثالثؒ کی معیت میں مدعو حضرات جاتے تھے۔ اس دوران صبح و شام کی تمام مصروفیات کی نگرانی اور نظم و نسق حضرت مولانا شہیدؒ کے منظّم ہاتھوں میں ہوتا۔ حضرت رائے پوری ثالثؒ کا حضرت مولانا شہیدؒ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر آنے جانے کا منظر اب بھی آنکھوں میں رچا ہوا ہے، جس سے حضرت رائے پوری ثالثؒ سے نہ صرف حضرت مولانا شہیدؒ کے تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا، بلکہ حضرت رائے پوریؒ کے ان پر اعتماد کی بھی جھلک نظر آتی تھی۔

حضرت اقدس رائے پوری ثالثؒ کی دورہ کے طلبا کو اجازتِ حدیث

اسی دوران ایک دن حضرت رائے پوری ثالثؒ اربابِ جامعہ، جن میں حضرت مولانا شہیدؒ پیش پیش تھے، کی پُرزور درخواست پر دارالحدیث جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن تشریف لائے اور نصیحت کے کلمات ارشاد فرمائے۔ اس موقع پر اساتذہ کرام کے اصرار پر دورہ حدیث کے منتہی طلبا کو اجازتِ حدیث بھی مرحمت فرمائی (راقم الحروف کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس سال دورۂ حدیث کا طالبِ علم تھا)۔ حضرت رائے پوری ثالثؒ کے اس قیام کے سبب جامعہ میں ذکر و فکر کی محافل نے ماحول میں پاکیزگی، حُبِّ الٰہی، اکابرِ حق کے تعارف اور ان سے تعلق کے رُجحانات کو فروغ دیا۔ (22)

دارالتصنیف میں حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ کی میزبانی

حضرت مولانا شہیدؒ اپنے علمی ذوق کے سبب ہمہ وقت تحقیق و تالیف میں مصروف رہتے تھے، جس کے سبب جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں بالائی منزل پر قائم ''دارالتصنیف'' ہی ان کا مسکن تھا، جس میں وہ مطالعے میں مشغول اور تحریر میں مصروف رہتے

www.rahimia.org

تھے۔ وہی ان کا کمرۂ ملاقات بھی تھا۔ چناں چہ حضرت رائے پوری رابعؒ جب بھی کراچی تشریف لے جاتے تو حضرت مولانا شہیدؒ ہی اُن کے میزبان قرار پاتے۔ اس کمرۂ ملاقات میں حضرت رائے پوریؒ سے ملنے والے بھی آتے تھے تو حضرت مولانا شہیدؒ آنے والے مہمانوں کی بھی خاطر تواضع کرتے اور ان کو حضرت رائے پوریؒ سے گفتگو کا موقع دینے کے لیے خود دارالتصنیف کے بجائے کسی اَور کمرے میں چلے جاتے اور اپنی تالیفی مصروفیات پر حضرتؒ کی تبلیغی مصروفیات کو ترجیح دیتے۔ سن 1978 یا 79ء کا واقعہ یادوں میں محفوظ ہے کہ حضرت رائے پوریؒ جمعیت طلبائے اسلام کے عیدملن اجتماع میں شرکت کے لیے خیرپور میرس (سندھ) آئے، وہاں سے فارغ ہوکر کراچی تشریف لائے تو حضرت مولانا شہیدؒ کا دارالتصنیف ہی آپؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور راقم الحروف کو (اس وقت تخصُّص فی الفِقہ میں تھا) بھی وہیں شرفِ استفادہ حاصل ہوتا رہا۔

دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں شرکت اور لاہور میں حضرت رائے پوریؒ کا استقبال

1980ء میں دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے اساتذہ و متعلقین کا ایک وفد کراچی سے عازمِ سفر ہوا، جس میں حضرت مولانا شہیدؒ کے علاوہ والدِ محترم حضرت مولانا محمد بدیع الزمانؒ اورحضرت مولانا سیّد مصباح اللہ شاہؒ سمیت کئی حضرات شامل تھے (راقم الحروف کو بھی اس وفد میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی)۔ جب یہ وفد واہگہ جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچا تو حضرت رائے پوری رابعؒ احباب کے ہمراہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہندوستان قیام کے دوران حضرت مولانا شہیدؒ نے خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کا سفر بھی کیا۔ ہندوستان سے واپسی پر حضرت مولانا شہیدؒ اور حضرت والدِ محترم کے ہمراہ جمعیت طلبائے اسلام کے مرکزی دفتر 56- میکلوڈ روڈ لاہور میں حضرت رائے پوری رابعؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور مختصر تبادلہ خیالات کی نشست رہی، جس کے بعد قافلہ واپس کراچی کے لیے روانہ ہوا۔

خانقاہِ رحیمیہ رائے پور سے حضرت مولاناؒ کا والہانہ تعلق

حضرت مولانا شہیدؒ اپنے اوقات میں نظم و ضبط کا پورا پورا لحاظ رکھتے تھے، لیکن مشائخ رائے پور کی موجودگی میں اپنے معمولات کو ان کی مصروفیات کے تابع کردیتے تھے، جو اُن کے خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور سے والہانہ تعلق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جب حضرت مولانا شہیدؒ مہتمم جامعہ تھے، اس دوران حضرت رائے پوری رابعؒ کے کراچی کے جو اسفار ہوئے، ان میں حضرت مولانا شہیدؒ نے شام کے وقت اپنی تدریسی سرگرمیوں پر شہر میں ہونے والے مختلف پروگراموں میں حضرت رائے پوریؒ کی معیت کو ترجیح دی، حتیٰ کہ نہ صرف جامعہ کے دارالحدیث میں حضرت رائے پوریؒ کے طلبا سے تفصیلی خطاب کا اہتمام کیا، بلکہ جامعہ کی دیگر شاخوں میں بھی حضرتؒ کی تبلیغی مصروفیات کا بھی انتظام کیا۔ اسی دوران حضرت مولانا شہیدؒ کی ایما پر جامعہ بنوریہ عالمیہ سائٹ ایریا کراچی کے مہتمم مولانا مفتی محمد نعیم نے بھی اپنے جامعہ میں حضرتؒ کے خطاب کا خصوصی انعقاد کیا۔

نظم وضبط اور وقت کی پابندی پر مبنی تدریسی انداز

حضرت مولانا شہیدؒ اپنی زندگی کے تمام معاملات کے حوالے سے نظم وضبط کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، چناں چہ تدریس میں بھی ان کی یہ خصوصیت نمایاں تھی۔ راقم الحروف کو ان سے ۹۵-۱۳۹۴ھ/ (74-1973ء) میں ''مقاماتِ حریری'' پڑھنے کا موقع

www.rahimia.org

ملا۔ وقت کی پابندی کے ساتھ ان کا یہ معمولِ تدریس جاری رہا۔ ہر روز مقدارِ تدریس متوازن ہوتی تھی اور تمام طلبا کو عربی عبارت کے قبل از درس مطالعے کی ترغیب دلانے کے لیے بلا ترتیب متعین کسی بھی طالبِ علم کو عبارت پڑھنے کی ذمہ داری دی جاتی، جس کے سبب ہر طالبِ علم ہر روز اپنے آپ کو مسئول جان کر محنت کرنے کی جستجو کرتا اور کوتاہی کی صورت میں تنبیہ کا سامنا کرتا۔ اس مقصد کے لیے طلبا کے رجسٹر حاضری میں رکھے ہوئے ایک کاغذ پر عبارت پڑھنے والے طالبِ علم کے ساتھ نقطے (•) کی علامت رقم کرتے، تا کہ ریکارڈ رہے اور تمام طلبا کو عبارت پڑھنے کا موقع ملتا رہے۔ عبارت پڑھنے کے بعد عربی کے نئے الفاظ کے معانی واشتقاقات سے آگاہ کرتے اور مکمل عبارت کا لفظی اور سلیس ترجمہ بیان کرتے۔ یوں طلبا میں ''مقاماتِ حریری'' کی مُسجّع و مقفّٰی عبارت سے شناسائی کو جلا بخشتے۔

امتحانی پرچہ جات کی جانچ پرکھ میں بھی اہتمام کے ساتھ ہر طالبِ علم کو اس کی محنت کے مطابق نمبر دیتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے اور پرائے کا کوئی تصور نہ تھا۔ تعلیمی سال کے آخر میں تعلیم میں کمزور ایک غیر محتاط طالبِ علم نے حضرت مولانا شہیدؒ کے بارے میں ایک دوسرے طالبِ علم کو نوازنے کا چرچا کیا، جو اتفاق سے حضرت مولانا شہیدؒ کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ اس کا حضرت مولانا شہیدؒ کو شدید رنج ہوا اور انھوں نے اس کو عدمِ اعتماد جان کر قبل از وقت درس کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ بعد ازیں درجے کے طلبا نے اجتماعی طور پر معافی کی درخواست کی تو حضرت مولانا شہیدؒ نے قبول کر لی، مگر طبعی انقباض کے سبب سلسلۂ تدریس جاری رکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ واضح رہے کہ اس وقت حضرت مولانا شہیدؒ کی جامعہ میں بنیادی ذمہ داری تحقیق و تصنیف تک محدود تھی اور اس وقت تدریس ان کے باقاعدہ وظائف میں شامل نہ تھی، وہ از خود اعزازی طور پر تدریس کے لیے کوئی ایک مضمون منتخب کر لیا کرتے تھے۔

دورانِ تدریس محض کتابی تعلیم پر انحصار نہیں کرتے تھے، بلکہ طلبا کی تربیت کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ چناں چہ ان میں پائی جانے والی کوتاہیوں کا عمومی تذکرہ کر کے ان کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلاتے، بالخصوص اَخلاقی کمزوریوں کے حوالے سے مسلسل اور واضح تنبیہ کرتے تھے، تاکہ طلبا میں اَخلاقی بلندی پیدا ہو۔ اسی طرح طلبا کو حفظانِ صحت کے اصولوں کی جانب بھی توجہ دلاتے۔ اس سلسلے میں وہ طلبا کے چائے کے معمول کے حامی نہ تھے اور خود بھی اس کا خیال رکھتے تھے۔ چناں چہ وہ ملاقات کے لیے آنے والوں کی دیگر مشروبات یا فواکہات (پھل فروٹ) سے ہی خاطر تواضع کیا کرتے تھے۔

وقت کی قدر و قیمت میں حضرت مولانا شہیدؒ کا عملی کمال

وقت کا منظّم استعمال اور اس کی قدر و قیمت کو عملی شکل دینے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ چناں چہ فراغت کے کسی وقت کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ اسی لیے کئی کتب کے تراجم کے مطبوعہ نسخوں میں اس کے شواہد موجود ہیں کہ ان کی تکمیل کسی ائیر پورٹ یا کسی ریلوے اسٹیشن کے انتظار گاہ میں ہوئی۔ گویا وہ مقامات، جہاں بالعموم لوگ اپنے سفری مسائل سے نمٹنے میں مصروف یا انتظار کے لمحات بِتانے میں مشغول ہوتے ہیں، حضرت مولانا شہیدؒ نے ان کو بھی بامعنی طور پر صحیح مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ آپؒ نے جن کتب کے تراجم کیے ہیں، ان کے انتخاب میں بنیادی طور پر جو مقصد بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے

آتا ہے، وہ یہ کہ معاشرے میں اسلامی اقدار کا غلبہ ہو۔ چناں چہ علامہ شیخ محمد بن سالم بیجانی کی کتاب ''**اصلاح المجتمع**'' کے ترجمے کے پیشِ لفظ میں درجِ ذیل دعائیہ کلمات درحقیقت حضرت مولانا شہیدؒ کے اس تصورِ دین کی جامعیت کی عکاسی کرتے ہیں، جو اُن کو اپنے مشائخِ حق سے حاصل ہوا۔ یہ درحقیقت شریعت، طریقت اور سیاست کا ایک حسین امتزاج اور وقت کی آواز ہے۔ حضرت مولانا شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اللہ جل شانہٗ ہم سب کو صحیح معنوں میں دینِ اسلام پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ ہمارا معاشرہ واقعتاً اور حقیقتاً اسلامی معاشرہ بن سکے۔ معاشرے کی اصلاح ہو اور ہم میں سے ہر شخص دینِ اسلام کا سچا سپاہی اور دینِ متین کا پورا پورا عامل اور **اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ** (اللہ کے دین کو غالب کرنے) کا شیدائی ہو۔ دوسروں کے رنگ میں نہ رنگنے، یا ظاہری چمک دمک اور زیب و زینت سے مرعوب نہ ہوں۔ حقیقت اور اصل پر نظر رکھیں۔ لوگوں کی پیروی اور ان کی اتباع کے بجائے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ان کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کریں۔ ان کی سنتِ مطہرہ کو زندہ کریں اور دونوں جہانوں میں کامیابی حاصل کریں۔''(23)

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کی اس دعا کے مطابق دین کے غلبے کی جامع جدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اُسوۂ نبویؐ کو اپنانے اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ بنانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثمّ آمین!

حوالہ جات وحواشی

1۔ شیخ عبداللہ ناصح علوان، اسلام اور تربیت اولاد (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار) دارالتصنیف جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی، 1993ء، جلد اول ص 106۔

2۔ ایضاً، ص 112۔

3۔ شیخ محمد بن سالم بیجانی، اصلاح معاشرہ اور اسلام (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار) دارالتصنیف جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی، 1990ء، ص 74۔

4۔ ایضاً، ص 25۔

5۔ ایضاً، ص 227۔

6۔ ایضاً، ص 229۔ شرعی اصطلاح میں قرآن وسنت میں جرائم کی مقرر کردہ سزا کو ''حد'' کہتے ہیں، دیگر جرائم کی سزا ''تعزیر'' کہلاتی ہے۔

7۔ ایضاً، ص 291۔

8۔ ایضاً، ص 361۔

9۔ ایضاً، ص 623۔

10۔ ایضاً، ص 646۔

11۔ ایضاً، ص 653۔

12۔ شیخ ناصح علوان، اسلام اور تربیت اولاد (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار) جلد دوم ص 191۔

www.rahimia.org

13۔ ایضاً، ص 280۔

14۔ ایضاً، ص 283۔

15۔ ایضاً، ص 308۔

16۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت الخ حدیث نمبر 1286.

17۔ ناصح علوان، اسلام اور تربیت اولاد (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار) جلد دوم ص 330۔

18۔ ایضاً، ص 399۔

19۔ ایضاً، جلد اول ص 15۔

20۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ڈویژنل ناظم نشریات کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

21۔ ان دنوں حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ حضرت رائے پوری رابعؒ کے سیاسی تجزیوں پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ وہ اس وقت متحدہ جمہوری محاذ(UDF) میں اپنی جماعت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ تحریک بحالیٔ جمہوریت میں جمعیت طلبائے اسلام کے نوجوانوں کی سرگرمیوں اور گرفتاریوں نے حزبِ اختلاف کی جماعتوں میں ان کے قد کاٹھ میں اضافہ کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی نجی محفلوں میں اس پریشانی کا ذکر بھی کرتے تھے کہ محاذ کے سربراہی اجلاس میں وہ واحد فرد ہوتے ہیں جو اپنی جماعت کے سربراہ نہیں، بلکہ ناظمِ عمومی تھے۔ اُن کی سرگرم خواہش تھی کہ جمعیت علمائے اسلام کے غیر سیاسی امیر کی جگہ انھیں امیر مقرر کر لیا جائے، جب کہ حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری ناظمِ عمومی کے منصب پر فائز ہوں اور اس مقصد کے لیے وہ جمعیت طلبائے اسلام کی تائید چاہتے تھے۔
1975ء میں جب ان کی خواہش کسی طرح مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ اور ان کے حلقے تک جا پہنچی تو غیر سیاسی مقامی و بیرونی مذہبی حلقوں نے سازشوں کے تانے بانے بننے شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے اپنی خواہش کا سارا ملبہ حضرت رائے پوریؒ کے حلقے پر ڈال کر امیر جمعیت سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا۔ یوں بالآخر 1976ء میں جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت طلبائے اسلام کی باہمی مفاہمت کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ انھی دنوں جمعیت طلبائے اسلام کے چند جذباتی نوجوانوں کی ملک کی عملی سیاست میں ضرورت سے زیادہ سرگرمیوں کا جمعیت طلبائے اسلام کے مرکزی حلقے میں نوٹس لیا جانے لگا کہ اس طرح تربیتی مقاصد کو زک پہنچ رہی تھی اور فکری گہرائی کی جگہ سطحی جذباتیت لے رہی تھی، جس کو مفتی صاحب موصوف نے بھی قبل از وقت بلوغت کا عنوان دے کر مرکزی قیادت کی تائید کی تھی، مگر پھر انھی قبل از وقت نابالغوں کی سرپرستی کر کے امیر جمعیت کی خوشنودی حاصل کی اور یوں غیر سیاسی عالمی مذہبی حلقوں کی خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے جمعیت علمائے اسلام حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی وراثت سے مکمل طور پر دست بردار ہو کر نام نہاد ''اسلام پسندوں'' کی حلقہ بگوش ہو گئی۔ فوا أسفیٰ

22۔ اسی سفر میں والدِ محترم حضرت مولانا بدیع الزمانؒ نے راقم کو حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ سے بیعت کرایا۔ حضرتؒ نے کلماتِ بیعت وتلقین ارشاد فرمانے کے بعد فرمایا کہ: ''ذکر کا طریقہ حضرت مولانا سعید احمد رائے پوری سے جا کر سیکھ لو'' چناں چہ حضرت رائے پوری رابعؒ نے طریقۂ ذکر کی تعلیم وتلقین کی۔ **فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک.**

23۔ شیخ محمد بن سالم بیجانی، اصلاح معاشرہ اور اسلام (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار) ص 12۔

☆

www.rahimia.org

ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کی ریلوے

''ہندوستان میں برطانوی سامراج نے فوجی قوت اور معاشی منصوبہ بندی کے تحت اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ بنگال سے شروع ہونے والی قبضوں کی لڑائی 1849ء میں پنجاب پر قبضے کی صورت میں ختم ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پر قبضہ 1857ء تک رہا۔1793ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے لینڈ ریونیو کی پالیسی نافذ کی جس کے تحت کمپنی کو زمین سے حاصل ہونے والی آمدن کو انتظامی یا پبلک ویلفیئر کے منصوبوں پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی تاہم یہ آمدن کمپنی کے لیے منافع تصور کی جاتی تھی۔ لارڈ کارنوالس نے 34,00,000 پاؤنڈز لینڈ ریونیو کی مد میں فکس کر دیے تھے۔ چناں چہ لینڈ ریونیو ہندوستان کی دولت کی لوٹ مار کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ کمپنی نے بنگال، بہار، اُڑیسہ میں دیوانی کے اختیارات حاصل کر کے اپنے لینڈ ریونیو میں مسلسل اضافہ کیا اور کسانوں کا براہ راست استحصال کر کے دولت کی لوٹ مار کی۔

ہندوستان کے وسائل کو ہڑپ کرنے کے لیے سمندری راستوں کے ذریعے سے تجارت پر کئی گنا اخراجات کیے گئے۔ کلکتہ سے پشاور تک بذریعہ جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) تجارت انتہائی مہنگی تھی۔ چناں چہ نوآبادیاتی عہد میں ہندوستان پر تجارتی کنٹرول رکھنے اور تجارت کے نام پر معاشی استحصالی سسٹم کو موثر بنانے میں ریلوے نظام کا استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں امپیریل ریلوے کے پھیلاؤ کا عہد 1850ء سے لے کر 1947ء تک جاری رہا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے لیے دولت اور خام مال کی صورت میں ایندھن کی فراہمی ہندوستان سے لی جاتی رہی۔ یہ ایندھن کپاس، گندم، معدنیات، دھاتیں اور خام لوہے کی صورت میں بذریعہ ریل برطانیہ اور دیگر یورپی ملکوں میں منتقل ہوتا رہا۔ برطانیہ میں لوکوموٹو انجن کی ایجاد 1804ء میں ہوئی تھی تاہم پہلی ریل گاڑی 1825ء میں چلائی گئی اور 28 سال بعد ہندوستان میں بھی پہلی ریل گاڑی چلا دی گئی۔''

(نوآبادیاتی ریلویز: برطانوی سامراج کا معاشی پہیہ، ص92)

www.rahimia.org

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

July- September,2018 Vol.10 Issue,3 Regd.370-S

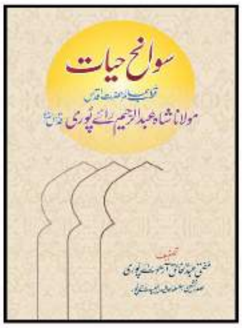

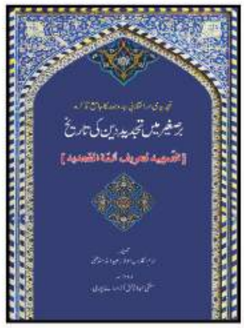

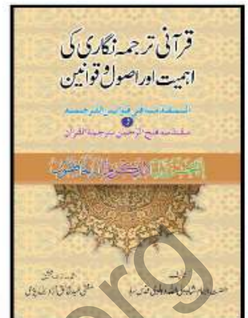

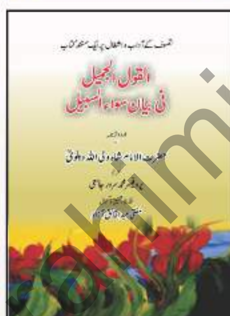

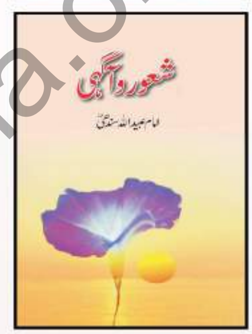

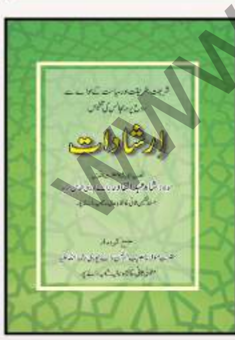

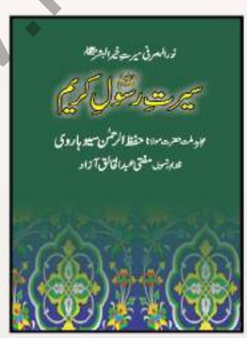

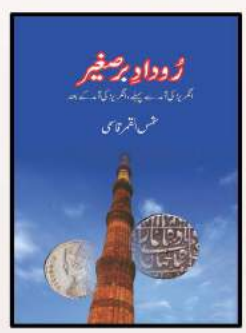

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org
info@rahimia.org /rahimiainstitute